(مؤلف) اس شعر میں جناب سہا نے۔ شبنم کی تخیل کی آڑ لے کر ہم مضمون ہونے کا اقرار کیا تھا۔ مگر بیخود صاحب نے صاف صاف اقرار کر لیا کہ دونوں خیال ایک ہیں۔

غالب ؎ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

آرگس۔ خسرو کا شعر ہے:۔

زہے عمرِ درازِ عاشقاں گر — شبِ ہجر از حسابِ عمر گیرند

دونوں شعر ایک ہی مضمون کے ہیں۔ البتہ مندرجہ ذیل خیال کچھ علیحدہ ہے۔

سپہری ؎ زخضر عمر فزونست عشقبازاں را
اگر ز عمر شمارند شام ہجراں را

غالب ؎ اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

آرگس۔ خاقانی کا شعر ہے:۔

من و بلائے تو قطع ادیم و تابِ سہیل — من و جفائے تو شاگرد و سیلیٔ استاد

اسی طرح ظہیر کا شعر ہے:۔

صدمہائے عشق را کے بوالہوس دارد قبول — کے شناسد طفل قدرِ سیلیٔ استاد را

غالب کے یہاں بصورت عمومیت، خاقانی کے یہاں بصورت خصوصیت، اور ظہیر کے یہاں بصورت نفی، ایک ہی مضمون کو باندھا گیا ہے۔ بنائے اشتراک خیال سیلیٔ استاد کے سوا کچھ نہیں۔

(مؤلف) اصل اعتراض کا جواب بیخود و سہا نے کوئی نہیں دیا۔ ——

غالب ؎ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

آرگس۔ عالی کا شعر ہے:۔

آب و رنگ گلستانِ عشق اکنوں از من است — عندلیباں ہر چہ میگویند مضموں از من است

دونوں مضمون تقریباً یکساں ہیں۔ عالی کے یہاں دبستان نہیں ہے مگر اُس کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔

(مؤلف) بیخود صاحب نے اعتراض کو تسلیم کر لیا ہے۔

غالب ؎ وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے   مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

آرگس - عرفی اس مضمون کو یوں لکھ چکا ہے :-

بکیشِ برہماں آنکس از شہید انست   کہ در عبادتِ بُت روئے بر زمیں میرد

دونوں کی بنائے اشتراک خیال وفاداری پر مبنی ہے - مضمون قریب قریب ایک ہے -

---

غالب ؎ بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی   سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

آرگس - یہ شعر فیضی کے اس شعر سے ماخوذ ہے :-

دریاب کہ ماندہ است ز دل قطرۂ خونے   واں قطرہ ہم از دست تو لبریزِ چکیدن

بیخود - میرے خیال میں دونوں شعروں میں بہت زیادہ فرق ہے - غالب کہتا ہے کہ میں ہمہ تن عجز و مجبوری ہوں - میرے پاس لے دے کے ایک دل تھا - جو خون کا ایک قطرہ تھا - اب اس کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ٹپکنے کے انداز سے سرنگوں ہو رہا ہے - یعنی یہ حالت ہو گئی ہے کہ یہ قطرہ بھی ٹپکا ہی چاہتا ہے -

فیضی معشوق سے کہتا ہے کہ دل میں اب ایک قطرۂ خون کے سوا کچھ رہا نہیں (یعنی پہلے بہت کچھ تھا) وہ قطرہ بھی تیرے ہاتھوں سے لبریزِ چکیدن ہے - یعنی فنا ہوا چاہتا ہے - اگر مجھے خبر لینا ہے تو دیر نہ کر - فیضی کا مطلب یہ ہے کہ تو نے جلا جلا کر یہ حال کر دیا ہے - مگر ابھی رحم کی گنجائش باقی ہے - غالب انسان کی مجبوری و بیدست و پائی کی داستان سناتا ہے - فیضی اپنی حالتِ زار دکھا کر معشوق کو مہربان کرنا چاہتا ہے - رہا دل کا قطرۂ خون کہنا مشہد بات ہے اور اغراض و مسلمات کے حکم میں ہے - اسے بنائے اشتراکِ خیال کہنا شرمناک غلطی ہے -

(مؤلف) بیخود صاحب نے بڑی نادیل بار کی ہے اس سے اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں کر سکے کہ فیضی معشوق سے التجائے رحم کرتا ہے - سو معترض اس پر یہ کہہ سکتا ہے کہ غالب کے شعر میں یہ مضمون رہ گیا اور وہ شعر کو فیضی کے درجہ پر نہیں پہونچا سکے - غالب کے یہاں لفظ (تھا) کے معنی (باقی تھا) اور فیضی کے یہاں (ماندہ است) دونوں ایک سے ٹکڑے ہیں - بیان واقعہ یعنی دل ایک قطرۂ خون رہ گیا ہے - اور وہ بھی آمادۂ چکیدن ہے دونوں میں ہے - پھر آخر اور اتحادِ خیال کیا کسی چیز کا نام ہے یا بیخود صاحب کا یہ مقصد ہے کہ لفظ بہ لفظ مل جائے تب خیال متحدہ ہے -

---

غالب ؎ مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان   نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

آرگس - خاقانی کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

نافِ زمین کعبہ گر نافِ مشک شد   کاندر سموم کرد اثر مشک زد فرش

نافۂ آہو شدہ است ناف زمین از رضا　　عقدۂ دو پیکر است پیکر باغ از ہوا

بیخود۔ میں اسے توارد سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ خیال پیش پا افتادہ ہے۔ اور غالب کے شعر سے اشعار خاقانی بہتر ہیں۔

(مؤلف) یہاں بھی بیخود آرگس کے اعتراض کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔

غالب ؎ مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

آرگس۔ یہ خیال خیام کی اس رباعی سے لیا گیا ہے:۔

مے خوردن من نہ از برائے طرب است　　نز بہر فساد و ترک دین و ادب است

خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے　　مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

غالب ؎ ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آرگس۔ فسونی تبریزی کا شعر ہے:۔

بہ رو چو میرسم آسودہ میشوم از دور　　ندیدہ حال مرا وقت بیقراری حیف

غالب کے یہاں یہ خیال نہایت عمدگی سے ادا ہوا ہے۔ مگر خیال ایک ہے فسونی کہتا ہے کہ میں جب اس کو دیکھتا ہوں آسودہ ہو جاتا ہوں وہ مجھے اچھا اور تندرست جانتا ہے غالب کے یہاں برعکس ہے

غالب ؎ تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے　　اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

آرگس۔ بیدل کا شعر ملاحظہ ہو:۔

ز جیب ہر مژہ آغوش می چکد ایں جا　　کہ جائے تو ہمہ در چشم دوستاں خالی است

غالب ؎ نہ ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب　　کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہئے

آرگس۔ میلی کا شعر یہ ہے:۔

دارد خموشی تا من حسرت کشیدہ را　　گوید شنیدہ ام سخن ناشنیدہ را

غالب ؎ زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے　　کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے

آر گس - بیدل لکھتا ہے :-

دیدہ راکہ بنظارۂ دل محرم نیست مژہ برہم زدن از دست ملامت کم نیست

غالب ؎ باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

آر گس - ذوق نے اس مفہوم کو یوں لکھا ہے :-

سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے اژدہا بن بن کے شب اہ رشک گلشن آب میں

فیضی و عرفی

فیضی نے جب اکبر کے حکم سے مثنوی نلدمن لکھی - اور انتہائی ناز و افتخار کے ساتھ اوس کو دربار اکبری میں پیش کیا تو اتفاق سے عرفی بھی موجود تھا - اگرچہ پہلے عرفی مدتوں تک فیضی کے خوان کرم کا ریزہ چیں رہ چکا تھا، مگر کچھ اسباب ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے معاصرانہ چشمک معاندانہ حد تک پہونچ گئی اور عرفی فیضی سے الگ ہوکر حکیم ابوالفتح اور خانخاناں وغیرہ کے جود و سخا پر اپنا گزارا کرنے لگا -

چنانچہ فیضی نے جب مثنوی کو اوّل سے پڑھنا شروع کیا - اور پہلا مصرعہ پڑھا کہ

اے در تگ و پوئے تو ز آغاز

تو عرفی اچھل پڑا - اور بآواز بلند کہا کہ سبحان اللہ - فیضی خوش گفتی - و بسیار خوش گفتی - دُر سفتی - بخوان بخواں - فیضی نے پھر پڑھا ؎

اے در تگ و پوئے تو ز آغاز طاؤس نظر بلند پرواز

عرفی نے دوسرا مصرعہ سنتے ہی اعتراض کیا کہ " فیضی طاؤس راچہ پرواز - ازیں بام تا آں بام - بلکہ بگو - عنقائے نظر بلند پرواز " یہ معلوم نہیں کہ فیضی نے اس اصلاح کو مانا یا نہیں مانا - مگر آج نلدمن کے جتنے نسخے پائے جاتے ہیں اون سب میں بجائے طاؤس کے عنقا ہی پایا جاتا ہے -

(مؤلف) فیضی پر جو اعتراض کیا گیا وہ صرف اس بات پر مبنی تھا کہ طاؤس بلند پرواز نہیں ہوتا - مگر نظر کی عنقا سے تشبیہ دی گئی ہے - جو خود ایک معدوم چیز ہے - اور یہی کسے معلوم ہے کہ عنقا بلند پرواز ہے یا مور کے برابر بھی اوس کی پرواز

لہ ۹۵۴ھ میں چار باغ نامی ایک بستی میں جو آگرے کے قریب دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے پیدا ہوئے - اور ۱۰۰۴ھ میں ضیق النفس اور استسقا وغیرہ کے مزمن اور مہلک عارضوں میں مبتلا ہوکر راہیٔ عدم ہوئے -

نہیں ہے۔ اس واسطے کہ اوسے کسی نے نہیں دیکھا۔ فیضی نے نظر کی تشبیہ اس لئے طاؤس سے دی تھی کہ نظر جب دیر تک ایک طرف جمی رہتی ہے تو اس میں طاؤس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور طرح طرح کے رنگ اوس کے سامنے آتے ہیں۔ اگر طاؤس میں بلند پروازی نہیں ہے تو نہ ہو تشبیہ بہ ادنےٰ ملابست جائز ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں یہ عیب ہے کہ تشبیہ تام نہیں ہے مگر عرفی کی اصلاح اچھی نہیں۔

فیضی ؎ ناخن چہ زنی رگِ جنوں را آگاہ نہ تپ درون را

عرفی - فیضی از ناخن چہ کار آید - بگو کہ نشتر چہ زنی رگ جنوں را

(مؤلف) اس وقت کے تمام نسخوں میں نشتر ہی پایا جاتا ہے۔ مگر ایک بہت قدیم نسخے میں میں نے ناخن بھی دیکھا ہے۔ یہ شعر اس جگہ کا ہے جہاں طبیب راجہ نل کو دیکھنے گیا ہے۔ اور غالباً ناخن زدن رگ سے مراد، نبض دیکھنا ہے۔ کیونکہ اس جگہ جراح کا ذکر نہیں ہے بلکہ طبیب کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ اس سے پہلے شعر ان میں کا ایک یہ شعر ہے۔

قارورہ شناس را طلب کرد گریاں شد و پرسش سبب کرد

اس لحاظ سے ناخن زدن مناسب تھا۔ مگر عرفی نے بوجہ رگ جنوں کے یہ اصلاح دی۔

میر وزیر علی صبا[1] و مولوی عصمت اللہ شاگرد ناسخ

صبا ؎ یہ ہم جلیس یہ ہمدم ہیں بزم ہستی تک لحد میں کوئی کسی کا شریکِ حال نہیں

اعتراض - ہم جلیس غلط ہے

جواب - یہ غلط العام ہے اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں

(مؤلف) جب مجیب خود اس ترکیب کو غلط العام کہتا ہے تو جواب دینا مدعی سست و گواہ چست کے مطابق ہوگا۔ مگر یہ کہنا کہ غلط العام کے استعمال میں کوئی ہرج نہیں ہے ایک حد تک صحیح ہے۔ اور ایک حد تک غلط۔ صحیح اس لئے کہ غلط العام کا بیشک یہی حکم ہے اور غلط اس واسطے کہ غلط العام کی حد میں لفظ ہم جلیس نہیں ہے۔ جلیس کے ساتھ ہم کی ضرورت نہیں

---

[1] صبا مرحوم کا نام میر وزیر علی تھا۔ آتش مرحوم کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے۔ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے پر سے گر پڑے اور انتقال کیا ایک دیوان ان سے یادگار ہے

مولوی عصمت اللہ کا تذکرہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کے مشہور شعراء پر اعتراض کئے تھے اور ایک رسالہ ترتیب دیا تھا۔ جن میں میر وزیر علی صبا بھی تھے۔ اسی کا جواب مولوی محمد آغا علی صاحب مدرس مدرسہ ریاست محمود آباد نے لکھا تھا

صبا ؎ عشق یوسف نے یہ کی خانہ خرابی برپا ٹھوکریں کھاتی زلیخا سرِ بازار پھری

اعتراض۔ خانہ خرابی برپا کرنا کہاں کا محاورہ ہے سند چاہیئے

جواب۔ اہل زبان سے محاورہ کی نسبت سند مانگنا یعنی چہ

(مؤلف) حقیقتاً اعتراض بالکل صحیح ہے۔ خانہ خرابی برپا کرنا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ خانہ خرابی کرنا محاورہ ہوسکتا ہے یہ کہنا کہ زباندان کو اہل زباں سے سند مانگنے کا کوئی حق نہیں بالکل غلط ہے۔ اس واسطے کہ وہ قواعد جن پر زباں داں حاوی ہوتا ہے وہ سب بھی اہل زبان ہی کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اور اُن سے باہر ہونے کا کسی اہل زبان کو حق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جاہل اہل زباں کو ایک عالم اہل زبان پر کوئی ترجیح نہیں دی جاسکتی بلکہ وہ اس سے کمتر مانا جائیگا

صبا ؎ موجد گلشن ہے تاثیر بیان عندلیب ہے نمونے نخل گل نوک زبان عندلیب

اعتراض۔ تاثیر بیان عندلیب موجد گلشن کیونکر ہوسکتی ہے لفظ موجد سے مصرع اول مہمل ہوگیا

جواب۔ سامعین کے دلوں کا باغ باغ کرنا تاثیر بیان عندلیب کا کام ہے۔ یہ تعریف تاثیر بیان بلبل کی غیر معتبر نہیں مسلم عام ہے۔ یہی گلشن کی ایجاد ہے۔ مگر اس بات کو وہی سمجھے گا جسے علم بیان کچھ یاد ہے

(مؤلف) اعتراض صحیح ہے۔ تاثیر بیان عندلیب کو موجد گلشن کہنا بالکل بے معنی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ باغ کیا کوئی ایجاد ہے جس کے لئے تاثیر بیان عندلیب کو موجد قرار دیا گیا ہے۔ اصل میں صبا مرحوم کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ عندلیب کے نغموں ہی کی تاثیر سے باغ میں بہار آتی ہے۔ اس مضمون کی گنجایش نہ دیکھی تو یوں کہدیا

صبا ؎ خط یہانتک لکھوں اُسکو کہ کردوں سب کو قلم ہاتھ لگ جائے اگر دشتِ نیستاں مجھکو

اعتراض۔ اس شعر میں دشت کی کونسی ضرورت تھی۔ واہ ری استادی

جواب۔ دشت نیستاں نہیں اصل میں دشت و نیستاں ہے آپ کے پاس جو دیوان ہے اس میں واؤ غلطی کاتب سے رہ گیا ہوگا۔ اور مقصود مصنف یہ کہ اشجار دشت اور نیستاں کے نے سب قلم کرڈالوں

(مؤلف) اعتراض صحیح تھا۔ مگر تاویل بھی اچھی خاصی کی گئی ہے۔ دوسرے مصرع کے متعلق یہ کہنا کہ اشجار دشت و نیستاں سب قلم کرڈالوں۔ کسی صورت سے قابل قبول نہیں ہے۔ مصنف کا مقصد یہ تھا کہ اگر نیستاں کا جنگل مجھے مل جائے تو اس سب کو کاٹ کر قلم بناڈالوں اور خط لکھوں۔ اون کو یہ معلوم نہیں تھا۔ یا یہ بات یاد نہیں رہی کہ نیستاں خود اس جنگل کو کہتے ہیں جہاں نے ہی نے ہو

صبا ؎ قرار اکدم نہیں ہے دیدۂ غم بیں میں آنسو کو نہیں آرام گہوارے میں بھی اس طفل بدخو کو

اعتراض - دیدۂ غم بیں کی ترکیب بھی دید نی ہے

جواب - جس نے کچھ دیکھا نہو اس کے واسطے دیدنی ہے میر ؎

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم بین کہیں تھا

دیکھا آپ نے یہ ترکیب کسقدر رچی ہوئی ہے - ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کیجئے - جس بات کا انجام خجالت ہو وہ اچھی نہیں -

مرد آخر بیں مُبارک بندہ ایست

(مؤلف) معترض کا اعتراض صحیح ہے - مگر مجیب کی یہ دیدہ دلیری کہ میر کے مصرع میں تحریف کر کے بجائے (غم گیں) کے غم بین بنادیا قابل داد ہے - میں نے کلیات مطبوعہ کشوری میں دیکھا تو (غم گین) ہی دیکھا - اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ غم بین کوئی ترکیب نہیں ہے اور کلام اساتذہ میں میری نگاہ سے نہیں گزری

صبا ؎ خدا کو انتہا لینی تھی اید ل جور گردوں کی وگر نہ کب عدم سے ہمسا آفت کوش آتا ہے

اعتراض - مصرعۂ اول مہمل ہے - اگر انتہا کے بدلے امتحان کہتے تو مضایقہ نہ تھا

جواب - کسی چیز کی انتہا لینی (اس چیز کا اندازہ کرنا خاص اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے - اور بہت فصیح محاورہ ہے - یہ کیا ضرورت ہے کہ جن محاورات سے آپ واقف نہوں ان کا استعمال نہ کیا جائے یا وہ درست نہوں

(مؤلف) اعتراض بالکل غلط ہے - انتہا لینا - تہاہ لینے کے معنے میں آتا ہے اور خاص لکھنؤ کا محاورہ ہے

صبا ؎ روزن ہیں تیرے دیکھنے کو دل کیواسطے آنکھوں کے اے صنم مرے منھ پر گڑھے نہیں

اعتراض - مصرعۂ ثانی کی ترکیب غلط اور نئی تشبیہ ہے - اور گڑھے کی فصاحت بھی دیدنی ہے

جواب - اہل بصیرت کے نزدیک تو ترکیب میں کوئی نقص نہیں تشبیہ اگر نئی ترکیب ہے تو مضایقہ کیا ہے - اور گڑھے کی فصاحت میں بھی آپ کو شبہ ہو تو لکھنؤ کے کسی فصیح کی زبان پر یہ لفظ نہیں ہے - آپ کا ہماری زبان کے لفظ کو نہ صیح جاننا اوسے پایۂ فصاحت سے نہیں گرا سکتا

(مؤلف) مضمون رکیک ضرور ہے - مگر غلط نہیں ہے - حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی لفظ بذاتہ فصیح ہے اور نہ غیر فصیح بلکہ محل استعمال الفاظ کو فصیح اور غیر فصیح بنادیتا ہے - گڑھا - سب جگہ مستعمل ہے - مگر جس جگہ استعمال کیا گیا ہے یہاں کوئی اچھا نہیں معلوم ہوتا - آتش مرحوم نے ایک جگہ ایک شعر لکھا ہے ؎

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

بھرے پر بھیک کے ٹھیکرے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ مگر اس کو غلط کہنا بھی درست نہیں ہے

صبا — سر محفل بٹھا کر چاہنے والوں کو رُلوایا ۔ نیا گا نا نکالا آپ نے بے تال بے سُر کا

اعتراض - بے تال و بے سر کے درمیان واوٴ عطف کیوں ہے۔ کہ تال کا لفظ ہندی ہے اور بے کا لفظ فارسی ہے

جواب - اپنے اعتراض کا تال سُر درست کیجئے شعر میں حرف عطف کی کہیں ضرورت ہی نہیں۔ اور نہ اصل میں ہے آپ نے کسی غلط دیوان میں یہ شعر دیکھا ہوگا

(مؤلف) یہ تاویل تو سراسر غلط ہے کہ آپ نے کسی غلط دیوان میں یہ شعر دیکھا ہوگا۔ اگر کوئی صحیح دیوان ایسا تھا کہ اس میں واوٴ عطف نہیں چھپا تھا تو معترض کو اس کا پتہ دینا چاہیے تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ صبا کا دیوان سو بچاس جگہ طبع نہیں ہوا بلکہ وہی ایک دو جگہ سب سے زیادہ وہ معتبر نسخہ ہے جو پہلی مرتبہ اردولی کا غذ پر طبع ہوا تھا۔ اس میں واوٴ عطف موجود ہے لہذا اس عذر بارد ہی کا درجہ دیا جائے گا۔ رہا یہ کہنا کہ شعر میں حرف عطف کی کہیں ضرورت ہی نہیں، یہ سراسر معترض کے قول کی تائید کرتا ہے

صبا — سرکشی پر جو وہ سرو ستم ایجاد آیا ۔ پاس آرے کے گھسٹتا ہوا شمشاد آیا

اعتراض - گھسٹتا ہوا کی فصاحت کی تعریف نہ زبان کو یارا کہ بیان کرے اور نہ قلم کو توانائی کہ لکھے

جواب - بندہ پر در گھسٹتا ہوا کی عدم فصاحت پر دلیل کیا ہے۔ صرف آپکا دعوےٰ یہ ہرگز معتبر نہیں۔ یہ تو ہمارے واسطے ہے کہ جس کو ہم کہدیں وہ فصیح ہے اور جس لفظ کو ہم غیر فصیح کہیں وہ فصیح نہیں ہے او قتیکہ زبان داں ہمارے مقابلہ پر نظیر نہ لائے

(مؤلف) میرے نزدیک گھسٹتا ہوا غلط یا غیر فصیح نہیں ہے۔ مگر مجیب کی یہ لنترانیاں کہ جسکو ہم غلط کہیں وہ غلط ہے اور جس کو ہم صحیح کہیں صحیح ہے زبردستی بلکہ جہالت کی حد تک پہونچتا ہے

صبا — شاید کہ وہ پری کہیں مسکرا رہا ۔ بجلی چمک رہی ہے بہت آسماں پر

اعتراض - مصرع دوم کی ترکیب بہت غلط ہے

جواب - آپ غلط کہتے ہیں۔ مصرع مذکور اس الزام سے بری ہے۔ کون سا شاعر ہے [illegible]س کے کلام میں یہ ترکیب داخل نہیں۔ اس میں برائی کیا ہے

(مؤلف) میرے نزدیک شعر کے مصرع ثانی میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ برعکس اس کے پہلا مصرع بہت بُرا معلوم ہوتا ہے

صبا ؎ دوڑ چلنا راہِ الفت میں کب ایدل چاہیئے رفتہ رفتہ چاہیئے منزل بہ منزل چاہیئے

اعتراض - مصرع اوّل کو مصرع دوم سے کچھ ربط نہیں یہ شعر مہمل ہے۔ مصنف نے جو معنی ٹھہرائے ہیں وہ اس ترکیب و بندش سے نہیں نکلتے

جواب - معنی شعر اور دونوں مصرعوں کا ربط تو ظاہر ہے مگر آپ زبان اُردو سے بخوبی واقف نہیں اس وجہ سے آپ سمجھ نہیں سکتے چلنا یہ فعل آخر مصرع دوم سے محذوف ہے۔ اور معنی یہ کہ راہِ اُلفت میں دوڑ کر نہ چلنا چاہیئے بلکہ آہستہ آہستہ اور منزل بمنزل چلنا چاہیئے

(مؤلف) اعتراض بالکل صحیح ہے۔ مصرعوں میں کوئی ربط نہیں۔ پہلا مصرع صحیح ہے مگر "رفتہ رفتہ چاہیئے منزل بمنزل چاہیئے" کوئی معنی نہیں رکھتا

صبا ؎ پئے گلگشت جو وہ طفل دبستاں ہوجائے بوستاں دفتر اوراقِ پریشاں ہوجائے

اعتراض - پئے گلگشت ہوجائے بھی نیا محاورہ ہے

جواب - اگر نیا محاورہ ہے۔ تو کیا قباحت ہے۔ یہ بھی تو اہل زبان ہی کا محاورہ ہے۔ زباں داں کو اس میں عذر کرنے کیا حق ہے

صبا ؎ صبا یہ اُس کا ہے موجد وہ اس کا موجد ہو بشر ہے غم کے لئے اور غم بشر کے لئے

اعتراض - موجد غم بشر مہمل۔ اور غم موجد بشر مہمل۔ معلوم نہیں کہ مصنف نے اپنے زعم میں موجد کے کیا معنے ٹھہرائے ہیں

جواب - یہاں موجد سے مجازاً باعث ایجاد مراد ہے۔ شعر ذیل میں لفظ قاتل ملاحظہ کیجئے ؎

گفتم مرو بکوئے بتاں دل رضا نداد آخر بخوں نشاند دلم قاتل من است

دیکھئے یہاں بھی قاتل بمعنی سبب قتل ہے

(مؤلف) یہ موجد ویسا ہی ہے جیسا کہ صبا کے اس شعر میں ؎

موجد گلشن ہے تاثیر بیان عندلیب ہے نمونے نخل گل نوک زبان عندلیب

اگر وہ صحیح ہے تو یہ بھی صحیح ہے۔ اور اگر وہ غلط ہے تو یہ بھی غلط ہے

صبا ؎ گھر چھٹے شہر چھٹے سارا زمانہ چھوٹے ایک وہ منتخب و چیدہ و مفرد دل جائے

اعتراض - مفرد کی فصاحت بھی دیدنی ہے

جواب - مفرد کی فصاحت میں بجز آپ کے کوئی شاعر عذر نہ کرے گا

(مؤلف) مفرد یکتا کے معنے میں لانا - اور پھر اس کو صحیح بھی سمجھنا زبردست ستم ہے

صبا سے مجھ سے نہ تم ملو جو محبت ہے زر کے ساتھ ممکن نہیں صفائی دل اس کدر کیساتھ

اعتراض - لفظ دل بھی کس صفائی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے

جواب - صفائی میں تو کچھ نقصان نہیں آپ کا دل ہی کچھ مکدر ہے

(مؤلف) دل کے لفظ میں تو مجھے کوئی خاص نقصان معلوم نہیں ہوتا - ہاں دوسرے مصرع کا قافیہ البتہ مشکوک ہے کیونکہ کدَر بفتحتین تیرہ ہونے کے معنی میں مصدر ہے - مگر ایسا غیر مانوس ہے کہ اردو کے شعر میں کسی طرح اچھا نہیں کدر البتہ مستعمل ہے

صبا سے نہیں ہیں ایک طرح سب طبع سے روشن دل اندھیرا رہتا ہی پائے چراغ کے نیچے

اعتراض - اس شعر کی ترکیب بہایت معقول ہے - اور پائے چراغ کے نزدیک اندھیرا رہنا بھی قابل دید ہے

جواب - ترکیب شعر معقول تو ہے مگر معقول کے نزدیک اور "پائے چراغ کے نزدیک" اندھیرا رہنا بھی کوئی نئی بات نہیں - یہ تو ایک بدیہی امر ہے - جس کو خدا نے بصارت دی ہے وہ روز دیکھتا ہے

(مؤلف) مجیب نے یہ نہیں سمجھا کہ معترض اس واقعہ پر اعتراض نہیں کرتا - بلکہ اُس کا اعتراض پائے چراغ کے نزدیک پر ہے جو فی الواقع غلط اور مہمل ہے (پائے چراغ) کے معنے چراغ کے نیچے کے ہیں "نزدیک" کیا بلا ہے

صبا سے مثل دیوانہ بہت شاہد آبی کف لائے وہ پری سیر کو جس دم لب دریا آیا

اعتراض - نہیں معلوم شاہد آبی کس جانور کا نام ہے اگر گومتی میں کوئی جانور آبی پیدا ہوتا ہو اور اُس کو شاہد آبی کہتے ہوں تو گفتگو نہیں - اگر شاہد آبی کے بدلے مردم آبی کہتے تو شعر درست ہو جاتا

جواب - مردم آبی کو اگر شاہد آبی کہا تو کیا بیجا کہا - اور آپ کے مقام سکونت سے تعجب ہے کہ آپ واقف نہیں - گومتی چھوٹا سا دریا ہے اس میں یہ جانور کہاں - دریائے شور کے ساحل پر اکثر دکھائی دیتے ہیں - اور یہ جانور ہماری زبان مطلق نہیں جانتے

(مؤلف) اعتراض یہ ہے کہ ایک جانور جو بشکل انسان و ماہی ہوتا ہے اوس کو بوجہ مشابہت انسانی کے لوگ مردم آبی کہتے ہیں - مگر ہے وہ دراصل ایک جانور - جیسا کہ خود مجیب کو بھی اعتراف ہے - پھر ان جانوروں میں شاہد و مشہود کا جھگڑا لگا دینا کس قدر مہمل اور بے معنی بات ہے - اوس کو صرف مردم آبی ہی کہہ سکتے ہیں - اعتراض بالکل درست ہے

صبا ؎ کس پاس سے کہتا ہوں میں انسے دمِ رخصت لو جاؤ تم اللہ نگہدار تمھارا

اعتراض - اللہ نگہدار تمھارا کیا فصیح محاورہ ہے - نگہدار کی جگہ نگہبان کہا ہوتا

جواب - نگہدار اُردو کیا فارسی میں بھی فصیح ہے اور وہاں کے فصحا ہمیشہ سے اس لفظ کا استعمال کرتے چلے آئے ہیں مثنوی بزم وصال حال میں عجم سے آئی ہے اور انگریزوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں شایع ہوئی ہے اُسے دیکھئے ؎

کہ یارب علی را نگہدار باش بہر کارش از لطف خود یار باش

یہ شعر اُسی مثنوی کا ہے - اور سعدی نے بوستاں میں فرمایا ہے ؎

جہانت بکام و فلک یار باد جہاں آفرینت نگہدار باد

جب آپ نے سیر بوستاں سعدی نہیں کی تو بزم وصال تک رسائی کہا

(مؤلف) نگہدار اور نگاہ دار کے صحیح ہونے میں کلام نہیں ہے - مگر اعتراض یہ ہے کہ رخصت کے وقت کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تمھارا نگہدار ہو - فارسی کا ذکر نہیں اُردو میں - اللہ نگہبان کہا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے بلاشبہ یہ اعتراض صحیح ہے

صبا ؎ ہو دورے میں جلوۂ طاؤس ساقیا مینا ضرور چاہئے سونے کے جام پر

اعتراض - دورے میں جلوۂ طاؤس سے کیا حاصل اگر رقص طاؤس کہتے تو مضایقہ نہ تھا

جواب - دورے میں رقص طاؤس سے جو حاصل ہے وہی جلوۂ طاؤس سے ہے یہاں مصنف کی غرض جام زریں کی تشبیہ تھی، ہنگام دور جلوۂ طاؤس کے ساتھ اس تشبیہ کو انھوں نے بہت اچھی طرح سے بیان کیا - اون کو جملہ لوازمات بزم میخواری کے بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی

(مؤلف) تشبیہ جو دیگئی ہے وہ مکمل ہے - مگر معترض کا یہ کہنا کہ اگر رقص طاؤس کہتے تو مضایقہ نہ تھا اور فاضل مجیب کا یہ جواب کہ رقص طاؤس سے جو حاصل ہے وہی جلوۂ طاؤس سے ہے - دونوں فضول سے ہیں اس واسطے کہ نہ تو طاؤس کی دورے کے وقت ضرورت پڑتی ہے - اور نہ کسی مجلس میکشی میں رقص طاؤس دیکھا گیا - میرے خیال میں جس خیال کے واسطے یہ تشبیہ تلاش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ باغ ہو اور طاؤس رقص کناں ہو تو لطف مے کشی اس سے دونا ہو جاتا ہے - سو یہ خیال نامکمل رہ گیا - اور مصنف اس کو ادا نہیں کر سکا

صبا ؎ عوض اللہ اس کا محکمے میں حشر کے لیگا کریگا جو سیاست حاکم ظالم رعیت پر

اعتراض - معلوم ہوتا ہے کہ مصنف سیاست کے معنی سے واقف نہ تھے - سیاست تو واسطے حاکم عادل کے ہے بغیر سیاست سلطنت قائم نہیں رہ سکتی چنانچہ حضرت مخدوم شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے گلستاں کے باب ہشتم میں فرمایا ہے سہ چیز

سہ چیز پائدار نماند - مال بے تجارت - علم بے بحث - ملک بے سیاست - اور سیاست کے معنے کتب لغت میں "پاس داشتن و حکم راندن بر رعیت و تنبیہ کردن و محفوظ داشتن خلق اللہ از گناہ" ہیں
جواب - تحقیق شعر کے واسطے صرف گلستاں کا پڑھ لینا اور غیاث اللغات کا ادنے پونے خرید کر طاق پر رکھ چھوڑنا کافی نہیں اس فن کے واسطے بہت کچھ دیکھنے اور سیکھنے کی ضرورت ہے سیاست کے معنے تورہ و قانون بھی ہیں اور مجازاً بمعنے کشتن و بستن بھی یہ لفظ آیا ہے - بہار عجم ملاحظہ کیجئے اور اصطلاح میں سیاست گر خونریز اور سفاک کو بھی کہتے ہیں باایں پایہ تحقیق اپنے آپ کو محقق کہنا ایسا ہی ہے جیسے میاں سبز علی پنجرے میں بیٹھے اپنے تئیں میاں مٹھو کہا کرتے ہیں آپ کی تحقیق اور صبا کی ناواقفیت کا حال ایسے اعتراض سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے
(مؤلف) جواب صحیح ہے سیاست کے معنی کشتن و بستن کے علاوہ قہر کے بھی آتے ہیں

صبا ؎ اے ترک تری باد بہاری ہی جلو میں اُڑتا ہوا جاتا ہے وہ گلگوں تہ راں ہے
اعتراض - مصرع اوّل کی ترکیب و بندش ناقص ہے اگر یوں کہتے تو اچھا تھا ع
اے ترک جلو میں ہے تری باد بہاری
جواب - اظہار تعجب کے واسطے وہی ترتیب الفاظ چاہئے تھی جو صبا نے اختیار کی - ذوق فہم سخن حاصل کیجئے
(مؤلف) اعتراض اور اصلاح صحیح ہے - صبا نے جس طرح کہا ہے اوس میں سخت تعقید ہے - اور اصلاح سے وہ تعقید دور ہو گئی ہے - یہ کہنا کہ تعجب کے واسطے یوں ہی کہنا چاہئے غلط ہے - صبا نے یقین کے لئے کہا ہے اور اس کے واسطے ہی بندش چست و درست ہے - تعجب کے لئے کوئی حرف موجود نہیں کہ مصرع اولے میں اس پر دلالت کرے

صبا ؎ نزع میں ہوں مرے بالیں سے نہ اٹھئے للہ آپ کس وقت میں بندے کو دغا دیتے ہیں
" اندنوں میں وہ ہوتا ہی ہمیں جوش جنوں بھاگتا ہے چھوڑ کر مجنوں بیاباں آجکل
اعتراض - ان دونوں شعروں میں میں کا لفظ بیکار ہے
جواب - کہیں میں کا لفظ بیکار نہیں - چونکہ آپ زبان اُردو سے بخوبی واقف نہیں ہیں اس وجہ سے یہ لفظ آپکو ان شعروں میں بیکار معلوم ہوتا ہے - شعر اوّل میں مصرع اوّل سے اگر میں کو علیحدہ کیجئے تو نزع ہوں باقی رہے گا نزع ہوں (نزع میں ہوں کی جگہ) مصرع دوم میں میں کا اس غرض سے آیا ہے کہ سامع کو استفہام کا شبہ نہو - آپ کس وقت بندے کو دغا دیتے ہیں - یہ جملہ مقصود مصنف پر ہرگز اس طرح دلالت نہیں کرتا جس طرح مصرع مصنف دلالت کرتا ہے - شعر دوم میں میں کا لفظ خاص دنوں کے وقوع میں جوش ظاہر کرتا ہے - گزشتہ سنین کے

واسطے بھی موجودہ صورت میں مصرع کے یہ معنی ہیں کہ ہر سال ان دنوں میں ہمیں روز جوش جنوں ہوتا ہے۔ اور اگر میں کو مصرع سے علیحدہ کر کے دیکھیں تو یہ معنے پیدا ہوتے ہیں کہ آجکل یعنی سال موجود کے خاص حصہ میں ہمیں روز جوش جنوں ہوتا ہے اور یہ معنی مقصود مُصنف نہیں۔ جناب من زبان اُردو ابھی اچھی طرح آپ نہیں جانتے کچھ دن اور سیکھئے

(مؤلف) اعتراض غلط ہے میرے خیال میں دونوں طرح پڑھتے ہیں بغیر میں کے بھی اور میں کے ساتھ بھی

مولانا صفیؔ لکھنوی و مرزا یاسؔ عظیم آبادی

صفی ؎ منھ میں کف۔ ہاتھ پہ سر۔ پاؤں میں زنجیر بہار درِ زنداں پہ کھنچی یوں مری تصویر بہار

اعتراض مرزا یاس۔ منھ میں کف اور ہاتھ پہ سر ہے۔ نہ معلوم کس کا سر ہاتھ پر ہے۔ کیونکہ اگر اپنا ہی سر بُریدہ ہاتھ میں ہو تو پھر کف کس منھ میں ہے۔ تن پر تو سر باقی نہ رہا۔ اور اگر اسی سر بریدہ دہن کف آلود کی طرف اشارہ ہے تو سبحان اللہ پھر نہ معلوم پاؤں میں زنجیر بہار کیسی۔ اول تو یہ تصویر ہی سر سے پاؤں تک (منھ میں کف۔ ہاتھ پہ سر۔ پاؤں میں زنجیر بہار) مضحک ہے۔ دوم یہ نہیں معلوم تصویر کھنچی کس کی۔ تصویر بہار کھنچی۔ یا تصویر قایل۔ کیونکہ ایک لفظ تصویر کی اضافت دو دو طرف (یعنی مری اور بہار) سوائے مہمل ہونے کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مری تصویر کے ساتھ بہار کی ردیف بالکل بیکار ہے۔ مگر ان حضرات کے نزدیک ردیف محض ایک بیکار شے ہے شعر سے کوئی معنوی تعلق ہونا ضرور نہیں گویا اک سخن تکیہ ہے کہ اثنائے کلام میں جا و بیجا ٹھونس دیا جاتا ہے

(مؤلف) اعتراض صحیح ہے

صفی ؎ سنگ مدفن کو مرے غور سے دیکھا کس نے خاک میں دوڑ گئے ریشۂ تاثیر بہار

اعتراض۔ وہی مثل ہے کہ راجا دیکھا رانی دیکھی حلق میں لکڑی کبھی نہ دیکھی، شاید جناب صفی نے کوئی خوردبین ایجاد کی ہے۔ جس سے ریشۂ تاثیر بہار کو بہت غور سے معائنہ فرمایا ہے۔ ورنہ آج تک ریشۂ تاثیر بہار کسی نے دیکھے نہ سنے

لہ مولانا صفی لکھنؤ کے ایک مشہور اور خوش فکر شاعر ہیں۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے پہلے آپ علی میاں کامل کے شاگرد تھے۔ مگر مشق سخن نے اب خود ہی آپ کو اُستاد تجربہ کار بنا دیا ہے۔ آپ نے علاوہ غزلوں کے قومی نظمیں بھی بہت سی کہیں اور اسی وجہ سے اب آپ کے نام کے ساتھ لسان القوم بھی لکھا جاتا ہے۔ آپ کا کلام سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ مگر معانی آفرینی آپ کا شیوۂ خاص ہے نہایت متین سنجیدہ بزرگ ہیں۔ مولوی گنج لکھنؤ میں مکان ہے۔ اب آپ کی عمر ستر پچھتر برس کی ہوگی مگر پھر بھی اپنے اخلاق اور لوگوں کی ضد اور اصرار کی وجہ سے اکثر شریک مشاعرہ ہوتے رہتے ہیں

ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ سنگ مدفن کو کسی نے غور سے دیکھا اور خاک میں ریشۂ تاثیر دوڑ گئے۔ آخر اس کا حاصل کیا ہوا

(مؤلف) میرے نزدیک یہ اعتراض بالکل غیر درست ہے۔ کیونکہ اس قسم کا اِدّعا ہر شاعر کے لئے جائز ہے۔ اور ایسے ہزارہا شعر اساتذہ کے کلام میں ملیں گے۔ معشوق کی تاثیر نگاہ کو بیان کیا گیا ہے کہ اوس کی تھوڑی سی نگاہ التفات میرے لئے اکسیر کام کر تی ہے کہ اک ذرا اس نے سنگ مدفن کو غور سے دیکھا اور قبر کو سراپا بہار بنا دیا

مغل[1] خاں صنعت۔ منشی لچھمی نراین شفیق

صنعت ؎ یار گھر جاتا ہے یارو کیا کروں ہائے گھر جاتا ہے یارو کیا کروں

اعتراض۔ اس شعر کا قافیہ درست نہیں ہے۔ مگر اس حالت میں کہ پہلے مصرع میں بجائے یار کے ماہ کہیں اور بجائے ہائے کے دوسرے مصرع میں آہ کہیں۔ مگر اس میں فصاحت کلام باقی نہیں رہتی

(مؤلف) اعتراض درست ہے۔ مگر میرے نزدیک پورے شعر کا بدلنا مناسب نہیں۔ بلکہ پہلے مصرع میں بجائے۔ گھر۔ کے گر۔ کر دیا جائے اور دوسرا مصرع جیسا ہے رہنے دیا جائے۔ اس طرح سے قافیہ بھی درست ہو جاتا ہے۔ اور ایک صنعت بھی پیدا ہو جاتی ہے

قائم[2] و شفیق

قائم ؎ یارب کوئی اُس چشم کا بیمار نہووے دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہووے

اعتراض۔ اس شعر میں اسی قدر نزاکت ہے کہ شاعر نے محاورۂ عام کے موافق موزوں کر دیا ہے اور دشمن کے دشمن سے خطاب کیا ہے لیکن دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ مصرع ہے۔ نباشد دشمن دشمن بجز دوست

(مؤلف) مطلب اعتراض کا یہ ہے کہ شاعر کہنا یہ چاہتا تھا کہ خدا کرے کسی بڑے دشمن کو بھی یہ آزار نہو اور کہہ گیا یہ کہ دوست کو بھی یہ آزار نہو ۔۔۔ مگر میرے خیال میں دوسرا مصرع یوں کہا گیا ہے ؎ دشمن سے بھی دشمن کو یہ آزار نہووے

---

[1] دکن کے قدیم شاعروں میں مغل خاں صنعت بھی تھے۔ لچھمی نراین شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں فتح علیخاں کے تذکرے سے دو شعر نقل کر کے لکھے ہیں۔ انھیں میں سے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے

لچھمی نراین شفیق اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ قوم سے کھتری تھے۔ عربی۔ فارسی اردو کے ماہر تھے۔ مختلف تصنیفیں ان سے یادگار رہیں جن میں بیاض تذکرہ چمنستان شعرا بھی ہے جو نہایت تحقیق سے لکھا ہے فارسی عبارت میں اردو کے شعرا کا حال لکھا ہے اور بعض بعض جگہ اُن کے کلام پر تنقید بھی کی ہے۔ [2] قائم تخلص تھا۔ قیام الدین نام تھا۔ چاند پور

کیونکہ محاورہ یہی ہے

قتیل[1] و مرزا غالب

قتیل ؎ یک وجب جائے بکوئے تو زخوں پاک نبود / کشتہ برکشتہ تپاں بود دگر خاک نبود

اعتراض مرزا غالب - یہاں پر (دوسرے مصرع میں بجائے خاک نبود) ہیچ نبود کا محل ہے۔ ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے ہیں

(مؤلف) مرزا کا اعتراض صحیح ہے۔ کچھ نہونے کی جگہ اہل فارس ہیچ - اور ہیچ نبودن کہتے ہیں

قتیل[2] و بیتاب

قتیل ؎ در رہِ عشق دلم شد ہدف تیر کسے / زخم من بہ شدنی نیست زِ تدبیر کسے

اعتراض بیتاب - زخم کے واسطے مرہم کی ضرورت ہے۔ تدبیر سے کیا ہوتا ہے۔ مرزا قتیل نے کچھ اس کے جواب دئے بیتاب نے فوراً اسی زمین میں یہ غزل کہی۔ اور قتیل سے داد سخن حاصل کی۔ لکھا ہے کہ قتیل نے اس اعتراض کو تسلیم بھی کرلیا تھا بیتاب کی غزل کا مطلع اور بعض شعر یہ ہیں

زد بہ کارم گرہی زلف گرہگیر کسے / کہ نہ شد وا ز سر ناخن تدبیر کسے
شب ہجو می بسرم بود وہم میگفتند / مردہ را زندہ کند معجز تقریر کسے
میر دم من نہ بخود سایہ صفت در دنبال / موکشاں می بردم زلف گرہگیر کسے
کرد ہر خانہ دل را کہ غم عشق خراب / نتواند شدن آباد ز تعمیر کسے
بندۂ عشق شد ار قید دو عالم آزاد / ہست وارستہ ز غم بستہ زنجیر کسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۳) متعلقہ سنبھل مراد آباد کے رہنے والے سودا اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے عمر کا اکثر حصہ دلی میں بسر کیا۔ ایک تذکرہ شعراء اردو ان سے یادگار ہے اور ایک ضخیم دیوان ریختہ بھی موجود ہے۔ نہایت ہی خوشگو۔ خوش مذاق اور پختہ مشق شاعر تھے ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا

[1] قتیل مرحوم کا نام مرزا محمد حسن تھا۔ لکھنؤ میں قیام تھا اور نواب سعادت علی خاں مرحوم کے زمانے میں اکابر اہل علم سے مانے جاتے تھے۔ قاضی محمد صادق خاں اختر سے اصلاح و مشورہ سخن لیتے تھے انشاء کے بڑے دوست اور ہمنشین تھے فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ اگرچہ مرزا غالب ان کو بالکل نہیں مانتے تھے۔ بہت سی کتابیں۔ اور ایک انشا ان سے یادگار ہے [2] بیتاب تخلص تھا۔ شیخ محمد حیات نام تھا۔

در دہجراں کشدم بہر خدا ہم نفساں ‎ ‎ بنمایند مرا جلوۂ تصویر کسے
شب چو بستند فغان دلم آں شوخ نگفت ‎ ‎ کرد بیتاب مرا نالۂ دلگیر کسے

ملا قدسی و ملا شیدا

قدسی ؎ ‎ عالم از نالۂ من بے تو چناں تنگ فضاست ‎ ‎ کہ سپند از سر آتش نتواند برخاست

اعتراض شیدا ؎ ‎ ای ہنرمند سخن سنج باندیشہ بہ سنج ‎ ‎ نقد ہر حرف بمیزان خرد بےکم وکاست
نالہ در سینہ ہوائیست کہ بے قصد رود ‎ ‎ چونکہ از سینہ ہوا گر شد ازش ہوا ست
عالم از وے نہ شود تنگ ولیکن ز ملال ‎ ‎ خلق عالم گر از دتنگ نشیند بجاست

قدسی کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ میرے نالوں سے اتنا بھرا ہوا ہے۔ کہ سپند بھی اب آگ سے چٹک کر اٹھ نہیں سکتا کیونکہ جگہ ہی نہیں ہے۔ شیدا کا اعتراض یہ ہے کہ نالہ ایک ہوا ہے جو سینہ میں رہتی ہے۔ اور بے قصد نکل جاتی ہے سینہ سے نکلنے کے بعد ہوا میں ملتی ہے پھر اس سے فضائے عالم کیا تنگ ہو گی۔ مگر ملال ایسی چیز ہے کہ اس سے زمانہ کی فضا تنگ ہو سکتی ہے

(مؤلف) میرے نزدیک شیدا کا اعتراض بیجا ہے اُس کا یہ کہنا کہ زمانہ میرے نالوں سے بھرا ہوا ہے، ایک مفروضہ بات ہے اور اس کو ادعائے محض کے سوائے اور کوئی درجہ نہیں دے سکتے۔ ملال اور نالہ دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ نہ تو ملال کوئی محسوس اور مرئی چیز ہے نہ نالہ پھر ان دونوں میں آخر فرق کیوں نکالا گیا ہے

مولانا آزاد بلگرامی نے بھی قدسی کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ جو ذیل میں درج ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ قدسی نے شاہجہاں کی تعریف اور حالات میں ایک کتاب بادشاہنامہ نظم کی۔ اسی میں جب عبداللہ خاں فیروز جنگ کا ذکر آیا تو مصرع کی گنجائش کی وجہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳۴) علی حزیں کے شاگرد تھے۔ بیتاب قتیل کے معاصر تھے لکھنؤ میں قیام تھا مگر بلگرام کے رہنے والے تھے۔ قاضی محمد صادق اختر کے دوست تھے۔ پہلے محمد صدیق سخنور سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ جب وطن سے لکھنؤ میں آئے تو چند روز تک سر سنگھ دیوانہ کے ساتھ رہتے رہے۔ مولوی غلام مخدوم سے عربی فارسی کی تکمیل بھی لکھنؤ ہی میں کی تھی۔ مرزا فاخر مکین اور میر قمر الدین منت سے مطارحہ اور مشاعرے ہوائے ـــــ ایک مرتبہ نواب غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کی مدح میں ایک قصیدہ کہا۔ جس کے صلہ میں سو روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے ہمیشہ ملتا رہا۔ اور اسی زمانہ میں بادشاہ نے بیتاب کی بجائے امید تخلص رکھا اوسی زمانہ ۱۲۲۹ھ میں انتقال ہوا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے قتیل سے اصلاح بھی لی ہے۔ بہرحال واقعہ کچھ ہو مگر تذکرۃ الشعرا فارسی مولفہ مولانا احسن بلگرامی میں لکھا ہے کہ قتیل نے ایک روز مشاعرہ میں غزل پڑھی جس کے مطلع پر سر مشاعرہ بیتاب نے اعتراض کیا

سے یہ نام بحر میں نہ آسکا۔ وہاں عذر مقام کے طور پر یہ شعر لکھا ہے

نہنگے کہ از غایت احتشام　　　نہ گنجد بہ بحر از بزرگیش نام

اعتراض - جہاں تک خیال کیا جاتا ہے نام کے بحر میں نہ سمانے کی مصنف نے دو وجہیں لکھی ہیں ایک غایت احتشام دوسری بزرگی - اس میں سے ایک زاید ہے - لہذا اسطرح اصلاح ہو سکتی ہے

نہنگے است از غایت احتشام　　　نہ گنجد بہ بحر از بزرگیش نام

اور معنی میں بھی ایک تکلف پیدا کیا جا سکتا ہے کہ شین کی ضمیر کو نام کی طرف راجع کریں - جس سے یہ معنی پیدا ہوں کہ وہ ایسا نہنگ ہے کہ اوس کے غایت احتشام کی وجہ سے اوس کا نام اسقدر بزرگ ہو گیا ہے کہ بحر میں اس کا نام نہیں سما سکتا - اور جو اصلاح دی گئی ہے وہ بھی معنی کو صاف ادا کرتی ہے

(مؤلف) قدسی نے یہ کہا تھا کہ وہ ایسا نہنگ ہے کہ اوس کے احتشام کی وجہ سے بحر میں اوس کا نام نہیں سما سکتا ـــــ مولانا آزاد نے اس بنا پر اعتراض کیا کہ غایت احتشام - اور بزرگی دو وجہیں بحر میں نام کے نہ سمانے کی شاعر نے قرار دی ہیں - مگر پہلی وجہ زاید ہے کیونکہ غایت احتشام ایسی چیز نہیں ہے کہ اوس کی وجہ سے بحر میں نام نہ آسکے - ہاں بزرگی کو ایک وجہ قرار دیا جا سکتا ہے - لہذا یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ اپنے احتشام کی وجہ سے وہ نہنگ ہے - اور بحر میں بزرگی کی وجہ سے نام نہیں آسکتا ـــ اس عالت میں میرے نزدیک اصلاح اور وجہ اعتراض دونوں درست ہیں - مگر اصل شعر بھی غلط نہیں - اور اگر اس میں شین کی ضمیر کو نام کی طرف راجع کریں تو یہ اعتراض خود ہی دفع ہو جائے گا

(نوٹ صفحہ ۲۳۵) قدسی تخلص تھا حاجی محمد جان مشہدی کا - جو ۱۰۴۲ھ میں اپنے وطن سے ہندوستان آئے - اور شاہجہان بادشاہ کے دربار میں پہونچے - سب سے پہلے جو بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ پڑھا اوس کا یہ مطلع تھا

ای قلم برخود ببال از شادی دکشا زباں　　　در ثنائے قبلۂ دین ثانی صاحبقراں

جسپر دو ہزار روپیہ صلہ میں ملا - اس کے بعد بارہا عنایت شاہی سے سرفراز ہوا - اور ۱۰۵۶ھ میں بعارضہ اسہال بمقام دار السلطنت لاہور انتقال کیا - بادشاہ نامہ وغیرہ ان کی تصنیف سے یادگار ہیں

ملا شیدا فتحپور سیکری کے رہنے والے تھے - نہایت زود گو اور مشاق تھے ایک لاکھ کے قریب شعر ان سے یادگار ہیں انھوں نے قدسی مشہدی کے ایک پورے قصیدہ کے ہر شعر پر اعتراضات کئے ہیں - جسکا مطلع یہ ہے اور صرف اسی ایک اعتراض پر ہم اکتفا کرتے ہیں - کیونکہ تذکرہ حسینی میں اب صرف یہی اعتراض پایا جاتا ہے - باقی اعتراضوں کا کوئی پتہ نہیں

قلق[1] ۔ و حالی

مولانا حالی ۔ " طلسمِ اُلفت میں اس موقع پر جبکہ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے شیدا وزیر اپنے شہزادہ کے لئے نسبت کا پیام لے کر شہر حسن آباد میں شاہانہ جاہ و حشم کے ساتھ پہونچا ہے اور حُسن آباد کے بادشاہ نے اس کے آنے کی خبر سنکر اپنے وزیر کو اس سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا ہے وہ صاحب مثنوی اس طرح بیان کرتا ہے

جاتے ہی اسنے قریب شہر پناہ　　خیمہ اپنا کیا بہ شوکت و جاہ
بسکہ دانائے روزگار تھا وہ　　مرد میدان کارزار تھا وہ
رعب پہلے ہی سے بٹھانے کو　　صولت و دبدبہ دکھانے کو
کی اُسی روز لشکر آرائی　　کثرت فوج سب کو دکھلائی
خبر آمد اوس کی عام ہوئی　　خلق دہشت زدہ تمام ہوئی
اتنے میں وہاں کے شہریار کو بھی　　خبر اُس کے ورود کی گذری
کہ کسی شہر کا کوئی سردار　　لے کے ہمراہ لشکر بسیار
آکے اترا ہے قریب شہر پناہ　　مستعد جنگ پر ہے وہ ذی جاہ
سنتے ہی وہ کمال گھبرایا　　وزرا کو بُلا کے فرمایا
دیکھو تو کس کا لشکر اُترا ہے　　کون ہم پر غنیم آیا ہے
الغرض اک وزیر با تدبیر　　اپنے ہمراہ لے کے فوج کثیر
تھا فروکش جہاں وہ ہم پایا　　وہاں ملاقات کے لئے آیا
سنتے ہی پاس یہ کیا اُس نے　　بے تکلف بُلا لیا اوس نے
تا لبِ فرش لینے کو آیا　　مل کے پہلو میں اپنے بٹھلایا
پہلے تو ذکر ادھر اُدھر کا رہا　　بعد اک طور سے یہ اوس نے کہا
کہ جہاندار جو ہمارا ہے　　اس فلک قدر نے یہ پوچھا ہے
آپ نے کی ہے کیوں یہ تکلیف　　کس ارادے سے لائے ہیں تشریف
سیر کا عزم ہے تو گھر یہ ہے　　ہر مسافر کا رہ گزر یہ ہے

---

[1] قلق تخلص خواجہ اسد اللہ نام تھا ۔ آفتاب الدولہ خطاب تھا ۔ وطن لکھنؤ تھا ۔ خواجہ وزیر مرحوم کے بھانجے اور بہادر حسین فراق کے بیٹے تھے واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے جاں نثاروں میں تھے ۔ انھیں کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے تھے

دل میں گر اور کچھ ارادہ ہو　　تو میں باہر نہیں ابھی آؤ

اس بیان میں قطع نظر لفظی کمزوریوں کے بڑی کسر یہی ہے کہ کلام مقتضائے حال کے موافق ایراد نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے بیان میں مؤرخ خود واقعات کے قبضہ میں ہوتا ہے اور قصہ میں واقعات اس کے قبضہ میں ہوتے ہیں تاریخ میں جس واقعہ کی صحت بخوبی ثابت ہو جائے اُس کی جوابدہی مؤرخ کے ذمہ باقی نہیں رہتی البتہ اوس کا یہ فرض ہے کہ اس کے اسباب کا تفحص کرے اور بتائے کہ کیوں ایسا واقع ہوا۔ بخلاف قصہ کے کہ اس کے بیان میں جو بے ربطی پائی جائے گی۔ اس کا ذمہ دار خود قصہ کا بنانے والا ہے۔ اوّل تو نسبت کے پیغام کو پہلے خط وکتابت کے ذریعہ سے طے نہ کرنا اور دفعتہً وزیر اور شاہزادے کے ساتھ ایک لشکر جرار روانہ کر دینا پھر وزیر کا فوج کثیر لے کر اور مہینوں کا رستہ طے کر کے حسن آباد کی شہر پناہ تک پہونچ جانا اور بادشاہ حسن آباد کو اس کے ارادہ کی مطلق خبر نہ ہوئی پھر اس کا حال دریافت کرنے کے لئے بادشاہ کا وزیر کو مع فوج کثیر کے بھیجنا پھر وزیر کا بادشاہ کی طرف سے مہمان کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جیسی کہ بازاریوں میں ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کچھ اور ارادہ ہو تو میں اس سے بھی باہر نہیں ہوں۔ میں بس اتنی ہی راہ دیکھتا تھا۔ اب دیر کیا ہے۔ بسم اللہ۔ بالکل مقتضائے مقام کے خلاف ہے

اس کے بعد شیدا وزیر بادشاہ عشق آباد کی طرف سے نسبت کا پیغام دینے کے بعد کہتا ہے

جاہ وحشمت کا کچھ اگر ہو خیال　　تو یہ بیجا ہے اے ہمایوں فال
آپ ہیں اپنے شہر کے سُلطاں　　بندہ ہے تاج بخش باجستاں
دل میں انصاف کیجئے تو صریح　　ہر طرح سے ہے بندہ کو ترجیح
کہ میں سلطان خسرواں ہوں آج　　بلکہ شاہنشہ جہاں ہوں آج
میرے قبضہ میں ہیں کئی اقلیم　　بخشتا ہوں میں افسر و دیہیم
مجکو وہ ہے خدا نے دی طاقت　　وہ مراد بدبہ ہے اور صولت
آج چاہوں تو باج دے قارون　　رُبع مسکوں پہ سکہ بٹھلاؤں
زور دکھلانے پر میں آؤں اگر　　چھین لوں تاج خسرو خاور
میں دلاور وہ ہوں وہ ہوں سفاک　　ہفت اقلیم میں ہے جسکی دھاک
سرکش آآکے پاؤں پڑتے ہیں　　ناک در پر مرے رگڑتے ہیں

اس کے بیان کی بے ربطی بھی ظاہر ہے کہ وزیر جس بادشاہ کی طرف سے نسبت کا پیغام ہے اور جسکا منصب عجز وانکسار کرنے کا ہے۔ اس کی طرف سے ایسی نامعقول گیدڑ بھبکیاں دیتا ہے اس کے بعد جب وزیر حسن آباد شیدا کی تقریر سنکر اپنے بادشاہ کے پاس واپس گیا ہے۔ اور وہاں جاکر اس نے شیدا کی تقریر کا اعادہ کیا ہے تو بادشاہ

حسن آباد اس کے جواب میں کہتا ہے

ہاں کہو جلد فوج ہو تیار — مایہ دولت کے لاؤ تو ہتھیار
دیکھوں تو کتنا حوصلہ ہے اسے — ہم سے عزم مقابلہ ہے اسے
لوہا دکھلانے کو یہ آیا ہے — ہم کو کیا موم کا بنایا ہے
بادشہ اس کا کیا ہے یہ کیا ہے — کثرت فوج پر یہ پھولا ہے

یہ تمام تقریر اسقدر سبک اور کم وزن ہے کہ ہرگز کسی بادشاہ کے منھ سے زیب نہیں دیتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی بادشاہ کی حماقت ظاہر کرنے کے لئے کوئی شخص اس کی نقل اُتار رہا ہے۔ پھر جب امیروں نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا ہے تو وزیر بادشاہ کی طرف سے شیدا کے پاس یہ مصالحت آمیز پیام لے کر چلا ہے

یہ تعلّی جو آپ کرتے ہیں — اتنا جرأت کا دم جو بھرتے ہیں
سابقہ ہو تو حال کھل جائے — ادھر آؤ تو حال کھل جائے
گو کہ میں تم سا خود پسند نہیں — سیکڑوں سے بھی پر میں بند نہیں
سر بھی جائے تو یہ قدم نہ ہٹیں — ٹل بھی جائے زمیں تو ہم نہ ہٹیں
یہاں تو رستم سے بھی نہیں ڈرتے — شیر سے بھی جری نہیں ڈرتے
کیا کروں پاس ہے شریعت کا — دھیان ہے دوستی والفت کا
شرم ہے میہماں کے آنے کی — رسم بھی ہے یہی زمانے کی
ورنہ سیر آپ کو دکھا دیتا — سب گھمنڈ آپ کا مٹا دیتا

یہاں تک خود بادشاہ کا پیغام بادشاہ کی طرف ہے۔ ان تمام ابیات میں الفاظ ومحاورات کی لغزشوں سے ہم کچھ بحث نہیں کرتے البتہ ہم کو یہ دکھانا منظور ہے کہ کلام بالکل مقتضائے حال کے برخلاف ایراد کیا گیا ہے اسی داستان پر کچھ موقوف نہیں اس مثنوی میں کہیں بھی اس بات کا خیال نہیں کیا گیا۔ کہ جیسا موقع ہو ویسی گفتگو کی جائے

اس داستان سے پہلے جہاں بادشاہ حسن آباد اور اُس کی بڑھیا ملکہ بیٹیوں کے عقد میں باہم مشورہ کر رہے ہیں اس طرح بیان کرتا ہے

ایک دن بادشاہ حسن آباد — اندرون محل تھا بادل شاد
اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا — محو راحت تھا مست عشرت تھا
اُس پریرو نے تخلیہ پا کر — عرض کی اختلاط میں آ کر

لڑکیوں کا نہیں کچھ آپکو دھیان　　ہو چکی ہیں سلامتی سے جوان
اور باتوں کا تو نہیں کچھ غم　　ہاں مگر یہ خیال ہے ہردم
کہ میں بیٹھی ہوئی ہوں بپا بہ رکاب　　طاقت جسم دے چکی ہے جواب
سب مہیا ہیں کوچ کے سامان　　اور دو چار دن کی ہوں مہمان
کچھ ہی دن اب سفر میں باقی ہیں　　ان کا سہرا تو دیکھ لیتی میں
سُن کے کہنے لگا وہ عالی جاہ　　تیرے کہنے ہی تک ہے کیا اے ماہ
بخدا خود خیال ہے مجھ کو　　جستجو بھی کمال ہے مجھ کو

اس تقریر میں بھی اکثر الفاظ بے محل و بے موقع استعمال ہوئے ہیں۔ بادشاہ خود شیخ فانی ہے۔ اور اس کی ملکہ بھی عجوز سالخوردہ ہے۔ وہ خود جا بجا کہتی ہے کہ میں پا در رکاب بیٹھی ہوں اور چناں ہوں اور چنیں ہوں۔ باوجود اس کے ایسے الفاظ استعمال کرنے۔ کہ اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا۔ یا محو راحت اور مست عشرت تھا۔ یا اس پر یہ یعنی بڑھیا نے اختلاط میں آکر عرض کی۔ یا بادشاہ کا اپنی بڑھیا ملکہ کو کہیں اے ماہ اور کہیں اے حور کہنا یہ سب باتیں مقتضائے حال کے خلاف ہیں

ایک جگہ جب کہ شاہزادے کو غش آگیا ہے اور یہی بڑھیا ملکہ جو اُس کی ماں ہے محل کے اندر گھبرا رہی ہے اور بار بار اس کی خبر باہر سے منگواتی ہے۔ ایک خواص باہر سے یہ کہتی آئی ہے

لوگو بتلاؤ تو کہاں ہیں حضور　　کہہ دو کیا بیٹھی کرتی ہو اے حور

پھر تھوڑی دیر کے بعد اور نوکریں آکر یہ کہتی ہیں

دوڑ سی دوڑ ہو رہی ہے حضور　　باہر اندر یہی ہے ذکر اے حور

دونوں جگہ ایک مصرع میں ملکہ سالخوردہ کو حضور۔ اور دوسرے مصرع میں اے حور کہنا اور پھر نوکروں کا اور وہ بھی نہایت تشویش کی حالت میں کہنا بالکل مقتضائے حال کے خلاف ہے

(مؤلف) مولانا حالی نے جو کچھ اعتراضات کئے ہیں سوائے اودھ پنچ سابق کے اور تمام دنیائے شاعری نے تسلیم کرلئے ہیں۔ یہاں مولانا نے علی الخصوص مثنوی سے بحث کی ہے میرے نزدیک یہاں کی تمام تر شاعری میں یہی حالت ہے۔ غزل۔ رباعی۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ واسوخت۔ سب کو ایک ہی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ رکیک مضامین مبالغہ، اور غلو ہی نے یہاں کی قدیم شاعری کو لوگوں کی نظروں میں حقیر کر دیا۔ موجودہ دور کے شاعر شاید کچھ گزشتہ کلام کی تلافی کر دیں۔ مگر دیکھیے کب وہ وقت آئے اور کب یہ بدنامی کا داغ لکھنؤ کی شاعری کے ماتھے سے چھوٹے

کاہی ، و ملا عبد القادر بدایونی

قاسم کاہی کابل کے رہنے والے تھے اور لوگ اُن کو میاں کالے میاں کالے کہتے تھے۔ ملا عبد القادر کا بیان ہے کہ ان کے کلام میں پختگی بالکل نہیں تھی۔ اور غیروں کے مضمون اکثر چُرا کر باندھا کرتے تھے۔ مگر ان کی ہیئت مجموعی نہایت عمدہ ہو جایا کرتی تھی۔ علم تفسیر اور ہیئت اور کلام تصوف میں بھی ان کو بڑی مہارت تھی۔ علم موسیقی میں بہت سی کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ معمہ اور تاریخ کے کہنے میں لاثانی تھے۔ اگرچہ پچھلے بزرگوں کی صحبت اون کو حاصل ہوئی تھی اور مولانا جامی کا زمانہ بھی پایا تھا۔ مگر تمام عمر اون کی الحاد ہی میں صرف ہوئی۔ کتوں کا بڑا شوق تھا

ایک مرتبہ ایک جوگی کی لڑکی کو دیکھ کر کاہی نے یہ شعر کہا

کاہی ؎ آتشیں روئیت چہ خاکستر چو نیلوفر شدہ   یا نقاب از آتش روئے تو خاکستر شدہ

اعتراض مُلا عبد القادر بدایونی - یہ مضمون مُلا وصفی کابلی کا ہے اور اس سے بہت قریب ہے ؎

از تب ہجراں نہ خاکستر مرا بستر شدہ   بستر از سوز من بیچارہ خاکستر شدہ

اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون وصفی کے مطلع سے قریب تر ہے۔ مگر سرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مضمون قطعاً جدا ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوسی مضمون سے ایک نیا پہلو نکالا گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے بہت سے مضمون عربی فارسی اُردو میں موجود ہیں۔ جنھیں یا تو استفادہ کی صورت میں لایا جا سکتا ہے۔ یا جواب کی حد میں۔ مثال کے لئے چند شعر دیکھئے

یزید ؎ انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راق   ادر کاساً وناولہا الا یا ایہا الساقی

حافظ ؎ الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا   کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

میرزا سلیم ؎ سلیم امشب بیاد تربت حافظ قدح نوش است   الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا

ظاہر ہے کہ حافظ اور سلیم دونوں نے، عربی کے مصرع سے نئے مضمون پیدا کر کے دوسرے مصرع لگائے ہیں۔ مگر یزید کے شعر سے علیحدہ ہیں۔ لہٰذا اس کو صرف استخراج مضامین و استفادہ کی صورت میں لایا جا سکتا ہے

حافظ کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل   کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

مگر یہ شعر سعدی کے اس شعر سے مستخرج معلوم ہوتا ہے ؎

از ورطۂ ما خبر نہ دارد   آسودہ کہ بر کنار دریاست

اور اسی حافظ کے شعر کو دیکھ کر غالب نے یہ کہا ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

اسی طرح خسرو کا یہ شعر

خسروا در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش — کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

اسی کو مدِ نظر رکھ کر یہ شعر کہا گیا

مبیں نقص زنِ ہندو کمالِ عشق را بنگر — کہ با نقص زنی خود را چہ ساں مردانہ میسوزد

فیضی نے یہ شعر کہا

در محبت ہیچو ہندو زن کسے دیوانہ نیست — سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

تینوں شعروں میں ستی کے کمال کا ذکر ہے۔ مگر مضمون سب کا علیحدہ ہے

اُردو میں میر تقی میر کا یہ شعر

ہم تو سمجھے تھے کہ لکھے گا کوئی حرف اے میر — پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

غالباً اسی سے فائدہ اٹھا کر مصحفی نے یہ کہا

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

میرا یہ شعر بھی مصحفی کے شعر سے مستفاد ہے

ہم تو سمجھے تھے کہ ہوگی کوئی بات اے آسی — تو نے تو قصۂ فرقت کو بڑا طول دیا

یا میر کا یہ شعر ؎

اسی طرح گر میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

یہ مضمون خاقانی کے اس شعر سے مستفاد معلوم ہوتا ہے

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت — خاقانی را دگر شب آمد

میر حسن کا یہ شعر بھی اسی انداز کا ہے

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

غالب کے ایک مضمون کا انداز ایسا ہی ہے مگر ترقی کے ساتھ

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں — دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

میرا ایک شعر ہے جو خاقانی کے شعر کو دیکھ کر کہا تھا

گریۂ غم پہ دل زار وہی بات آئی — لوگ چلائے کہ آسی تجھے پھر رات آئی

غرض کہ اس قسم کے سینکڑوں شعر ہر زبان میں موجود ہیں۔ مگر ایک مضمون کو دوسرے سے ملتا دیکھ کر صرف سرقہ کا حکم لگانا زیادتی ہے

کلیم[1] ہمدانی و آزاد بلگرامی

مولانا آزاد بلگرامی نے کلیم کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے

؎ معشوق خورد سال در آید بہ قید ضبط — حرفے کہ قد کشید ز پستاں بر آمدہ

اعتراض۔ قید اور ضبط قریب قریب مترادف الفاظ ہیں۔ ان میں اضافت لانا قابل غور ہے۔ اگر واو عطف درمیان میں لائیں تو بھی ان دونوں لفظوں میں سے ایک زائد رہتا ہے

(مؤلف) فی زماننا الفاظ مترادف یا قریب المعنی میں اضافت و عطف لانا کچھ معیوب نہیں۔ بہت سے شعر اس قسم کے موجود ہیں اوّل تو یہی کہنا زیادتی ہے کہ دنیا میں مترادف المعنی الفاظ کا وجود ہے۔ کیونکہ مترادف المعنی کوئی نہیں

میر عقیل کوثری[2] و مرزا فاخر مکین

کوثری ؎
یکے شوریدہ باغے داد ترتیب — نموئے از ریاحیں زیب تزئیب
بآب دیدہ پرورد ے گلشں را — زگلہا مژدہ دادے بلبلش را

اعتراض۔ تزئیب کو ظاہر الفظ زیب سے نکالا ہے۔ جیسا کہ مزیب آراستہ کے معنی میں لاتے ہیں مگر ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جب زیب فارسی الاصل لفظ ہے تو مزیب اور تزئیب کیونکر صحیح ہوگا۔ اس قسم کی غلطیاں ناواقفوں کے کلام میں بہت سی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ مزلف۔ مرغن مستعمل ہیں اور افسوس یہ ہے کہ بعض اوقات ان الفاظ سے اہل علم بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں

جواب مرزا سودا۔ چونکہ اشرف علی خاں نے بیاض دستخطی شیخ علی حزیں سے یہ قطعہ نقل کیا ہے اس واسطے ان پر یہ اعتراض نہیں پڑ سکتا بلکہ شیخ علی حزیں پر پڑتا ہے اور علی حزیں وہ شخص ہے کہ دنیا بھر اس کے لکھے ہوئے کو سند جانتی ہے۔ انھوں نے جو تزئیب کو صحیح سمجھا تو ممکن ہے کہ اس کی اُن کے پاس کوئی سند بھی ہو۔ دوسرے استادان سلف نے اکثر فارسی کے الفاظ کو معرب کر لیا ہے اور اپنے اشعار میں لائے ہیں۔ چنانچہ خلاق المعانی خاقانی نے تحفۃ العراقین میں ذوالخورشیدین لکھا ہے۔ع ذوالخورشیدین شد خراساں۔ اور تقی اوحدی صفاہانی نے اپنے تذکرہ میں فیضی

---

[1] کلیم کاشانی عہد جہانگیری و شاہجہانی کا مشہور و معروف شاعر تھا۔ جس نے دونوں درباروں سے صلۂ شعر حاصل کیا اور عمر بھر ہندوستان کا دلدادہ رہا۔ دوسرے شعرائے ناحق شناس کی طرح ہندوستان سے بیزار نہ تھا۔ بلکہ ہندوستان کی جدائی کو اس درجہ محسوس کرتا تھا۔ کہ فراق ہند میں ایک غزل لکھی تھی۔ اور اسی وجہ سے دو مرتبہ اپنے وطن سے کھینچ کر ہندوستان آیا۔ آخر پندرھویں ذالحجہ ۱۰۶۱ھ میں کشمیر میں انتقال کیا اور محمد قلی سلیم کی قبر کے قریب مدفون ہوا [2] کوثری سادات ہمدان میں سے مذہب شیعہ رکھتے تھے۔ اور شاہ عباس کے زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ ایک کتاب مثنوی

کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " جمعے متاخرین حتے مولانا عرفی ابکارۂ تیغ مہند طبعاں از سوہان فطرت و مصاحبت او باصلاح آمدہ " اب معلوم کرنا چاہیے کہ مہند کے معنی یہاں (در ہند ساختہ شدہ) کے ہیں۔ تیسرے یہ کہ مُلّا کو خری خود ولایت زا ہیں اور اسی طرح اہل عرب نے اکثر فارسی کے الفاظ کو معرب کرکے بے تکلف استعمال کیا ہے۔ چنانچہ لفظ باَدہ فارسی ہے اس کو معرب کرکے مبعی لائے ہیں۔ جب یہ صورت ہے تو زیب سے تزئیب کہنا کیا ہرج کرتا ہے۔ اس کے علاوہ حزیں نے جو کچھ لکھا ہے اوس پر اعتراض کرنا ہمارے حوصلہ سے زیادہ ہے۔ اسی طرح مُزلّف جس کی اصل و مادّہ زلف ہے اسقدر اہل ایران کی زبان پر ہے کہ اصطلاح بن گئی ہے اور اس کی صحت میں اب کوئی کلام نہیں ہے۔ ولایت والے اور ہند دونوں کہتے ہیں امیر خسرو کا یہ شعر بھی ایسا ہی ہے ؎

موران خط بد در خطِ مصحف کشیدہ اند　　　صد گونہ جور از تو مزلف کشیدہ اند

اسی طرح ملا محمد اشرف کا یہ شعر ؎

ہمچو رخسار مزلف دلبران تازہ خط　　　مصحفے گرمے نوشت آنہم خط خوانانہ داشت

(مؤلف) یہ اعتراض تو صحیح ہے کہ یہ لفظ فارسی ہے اور زیب سے مزیب بنایا گیا ہے۔ مگر جب اس قسم کے الفاظ کو اہل عجم نے عربی کے قاعدہ پر لانا جائز سمجھا ہے تو پھر اعتراض کی وجہ کوئی نہیں معلوم ہوتی۔ مرزا سودا کا جواب بہت کافی ہے۔ انھیں کی تائید میں ہم مُشَشدر اور مطلا بھی پیش کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ظہیر فاریابی کا یہ شعر ؎

مُہرۂ گل شد زمیں از روئے مہر آں مہرہ را　　　بر بساط امر او نقش مششدر یافتند

اسی طرح لفظ مُتَرَش جو تراشیدہ کے معنی میں ہے اور تراش سے بنایا گیا ہے اس کو عربی زبان سے کوئی نسبت ہی نہیں معلوم ہوتی مگر اس کو بھی بقاعدہ عربی اسم مفعول بناکر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ابو نصر نصیرا ے بدخشانی کا یہ شعر شاہد عادل ہے ؎

در رہ شرع و در رہِ ایماں رہبر باید صاحب ایماں　　　نزد مسلماں نبود شایاں بہر امامت مردِ مُتَرَش

اسی لفظ کو ملا مفید بلخی نے کہا ہے ؎

ہر گل کہ خار خار طمع سر نہد از و　　　در دیدہ بد قماش چو روئے مترش است

اسی لفظ کو فیضی صاحب مدار الافاضل نے بے تکلفانہ اس شعر میں استعمال کیا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۳) شیریں فرہاد ان سے یادگار ہے۔ جو نہایت عمدہ کہی ہے۔ اوسی کتاب میں سے ایک قطعہ مصنف ریاض الشعرا نے اپنے یہاں نقل کیا ہے۔ اس سفینہ یا بیاض پر شیخ علی حزیں کے بھی دستخط تھے اشرف علی خاں نے اسی بیاض دستخطی حزیں سے یہ قطعہ اپنے اس تذکرہ میں نقل کیا جو مرزا فاخر مکین کو اصلاح کے لئے دیا تھا۔ جس کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔ مرزا نے قطعہ کے پہلے شعر پر اعتراض کرکے قلم زد کردیا۔ جس کا جواب مرزا سودا نے دیا ہے

امرداں گرچہ گل گلشن حسن اند ولے　　　خار خار دل ازاں شوخ مُترّش باشد

منصور نے یہ شعر کہا ہے ؎

ازبسکہ ہمہ جاں بدیار شدی　　　چوں حسن مترش بنظر خار شدی

مُطلّا کی نسبت خان آرزو نے لکھا ہے کہ یہ لفظ دو وجہ سے صحیح ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ طلا لفظ فارسی ہے اس کو فارسی زبانان عربی داں نے عربی کے صیغہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ مترش۔ دوسرے یہ کہ طلا طمع کرنے کو عربی میں کہتے ہیں۔ جیسے طلا اندود۔ لہٰذا اس کو بھی مطلا کہتے ہیں۔ اور یہ بطریق اطلاق عام کے خاص پر اس وقت صحیح مانا جائے گا جب کہ اندودن بخیر مایہ کو بھی عربی میں طلا کہا ہو۔ عبد اللہ ہاتفی ؎

فگندند گرداں پے وہم و بیم　　　براسپان تازی مطلا لجسیم

ملا طغرا در تعریف گلنار ؎

بخنگاں کے روے ازشے بہر زینت میکنند　　　درحقیقت نقرہ از خامی مطلا می شود

اس کے ماسوا جب اہل زبان نے تحرمز، حرام زادگی کے معنے میں اور تکشمر، کشمیر زادگی کے معنی میں صحیح سمجھا اور استعمال بھی کیا ہے تو پھر مُرتِب کی صحت میں کیا کلام باقی رہتا ہے۔ نعمت خاں عالی نے کہا ہے ؎

اے سفلہ تمام کار و بار تو دغاست　　　ایں جا بہ ادب باش تکشمر بیجا است

لالہ[1] و شفیق

لالہ ؎　　　اگر ٹک ناز سے ابرو چڑھا چیں بر جبیں کھینچے　　　مہ نو جوں کماں گوشے میں جا کر خط کیں کھینچے

شفیق۔ میرے نزدیک مصرع اولے اس طرح ہونا چاہیئے تھا ع

مہ نو تیغ مغرب ساں دم اپنا واپسیں کھینچے

(مؤلف) شفیق نے اگرچہ اس اصلاح کی کوئی وجہ نہیں لکھی۔ تاہم جہاں تک میں خیال کرتا ہوں لالہ کے مصرع کو الجھا ہوا سمجھ کر یہ مصرع کہا ہے اور اس لحاظ سے ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ واقعی مصرع ثانی الجھا ہوا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ پہلا مصرع یوں ہونا چاہیئے تھا۔ کچھ اچھا نہیں۔ کیونکہ لالہ نے پہلے مصرع کو حرف شرط اگر سے مقید کر کے دوسرا مصرع اوس کی جزا کے طور پر کہا ہے۔ لہٰذا خواہ اصلاح دی جائے یا نہ دی جائے اسی طرح بہتر ہے۔ اگرچہ تقدم جزا شرط پر کلام اساتذہ میں موجود ہے۔ مگر بیضرورت یہ کچھ اچھا نہیں

---

[1] سرونجی رائے نام تھا لالہ تخلص کرتے تھے۔ غزل اکثر کہتے تھے۔ منشی لچھمی نرائن شفیق کے دوست تھے اور انہیں کے معاصر تھے۔ شفیق کے حالات اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے

متین کشمیری و میر محمد علی رنج سیالکوٹی

متین مرحوم کا نام محمد علی خاں تھا اور متین تخلص تھا۔ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ایک تذکرہ حیات الشعرائے فارس کے حال میں لکھا تھا۔ جو اب نایاب ہے

میر محمد علی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے زیادہ بریں کچھ حال معلوم نہیں ہوسکا۔ مولانا آزاد نے تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں آفریں لاہوری کے ذیل میں ذکر کیا ہے کہ متین نے شاہ آفریں کا یہ شعر مطلع بنا کر اپنے نام سے لکھا ہے

آفریں ؎

ساغر بکف چو تصویر رندیم و پارسائیم   در مشربے کہ مائیم آلودہ دامنی نیست

متین نے ادنیٰ سا تغیر کرکے یوں مطلع بنایا ہے اور اس کو اپنا ہی مال قرار دے لیا ہے ؎

ساغر بکف چو تصویر رندیم و پارسائیم   آلودہ دامنی نیست در مشربے کہ مائیم

متین نے یہ شعر جب رنج سیالکوٹی کے سامنے پڑھا۔ تو انھوں نے اعتراض کیا

اعتراض رنج ۔ شعر ناموزوں ہے۔ اور تصویر کی (رے) زاید ہے

جواب مولانا آزاد ۔ یہ وزن بحر مضارع کا ہے جس کی تقطیع یہ ہے۔ مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن۔ کبھی کبھی فاعلاتن مسبغ آتا ہے۔ اور تسبیغ اُس کو کہتے ہیں کہ سبب خفیف میں جو کہ آخر جزو میں واقع ہو اس میں الف زیادہ کر دیں پس فاعلاتن فاعلاتان ہو جاتا ہے۔ اوس کی بجائے فاعلیّان کر دیتے ہیں اور یہ فاعلیان مصرعوں کے آخر میں بھی آتا ہے اور وسط میں بھی قاعدہ یہ ہے کہ اگر ایک مصرع میں فاعلیان اور دوسرے میں فاعلاتن آوے تو شعر ناموزوں نہ ہوگا چنانچہ میرزا صائب کا یہ شعر اسی طرح کا ہے

ہر شبنمی دریں باغ جام جہاں نمائے است   ہر خار ایں بیاباں انگشت رہنمائے است

(مؤلف) مولانا کا جواب صحیح ہے۔ اور معترض کا اعتراض غلط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترض عروض کے قواعد سے ناواقف تھا

مصحفی و انشا

شیخ غلام ہمدانی نام تھا مصحفی تخلص امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز شباب ہی سے طالب علمی کی اُمنگیں امروہہ سے کھینچ کر دلی لے آئی تھیں۔ اور اس سنگین زمانے کے گزارنے پر بھی امروہہ واپس نہیں گئے تھے بلکہ دلی ہی میں قیام تھا یہیں رہتے سہتے تھے اور شعر و سخن کے مشغلہ میں اوقات گزاری کرتے تھے۔ اس سے زیادہ دلی کے قیام کا وسیلہ معلوم نہیں ہوسکا او۔ نہ اُسی بادشاہ گردی کے عالم میں اوروں کی طرح یہ بھی لکھنؤ آئے اور استادی کا ڈنکہ پیٹ دیا۔ نزدیک و دور سے اہل عقیدت جمع ہو گئے۔ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں انکار سوخ ہوا اور وہیں سے کچھ آذوقہ بھی بہم پہونچنے لگا

اسی دوران میں انشا بھی وہاں آنے جانے لگے۔ کوئی طرح ہوئی اُس پر انھوں نے غزل لکھی۔ زمانہ کا دستور ہے کہ دوسرے کی ہوا اکھاڑ کر اپنی ہوا جماتا ہے۔ اور دوسروں کی بات بگاڑ کر اپنی بات بناتا ہے۔ اسی روش پر سیّد انشاء اللہ بھی چلے۔ باتوں باتوں میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور ان کی غزل پر اعتراض کیا۔ یوں تو انشاء عالم تھے۔ قابل فاضل نقاد تھے مگر اس کے ساتھ ہی تمسخر اور خودستائی بھی مزاج میں حد سے زیادہ تھی اس پر طرّہ یہ کہ بڑی سرکاروں اور مہتم بالشان درباروں میں تقرب تھا اوس نے اور بھی دماغ میں ہوا بھر دی تھی۔ کچھ دلی اُمنگیں۔ کچھ جوانی کے ولولے۔ کچھ تماشا دیکھنے والوں کی حوصلہ افزائیاں۔ کچھ اپنی فضیلت و قابلیت کا ناز کچھ رسوخ کی تمنا۔ یہ سب چیزیں انھیں اس بڈھے جہاں دیدہ گرم و سرد عالم چشیدہ کے مقابل میں لے آئیں۔ اور ایسا ہنگامہ بپا ہوا کہ بقول آزاد سوانگ نکلے۔ اور انشاء اللہ خاں کے شاگرد راستوں اور گلیوں میں یہ کہتے پھرتے تھے ؎

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن ۔۔۔ لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

مصحفی کی ایک غزل ہے :-

مصحفی ؎ دل کیونکہ پری حور کا پھر اس پہ نہ پھسلے ۔۔۔ صانع نے بنائی تری بلور کی گردن

اعتراض انشا ؎ بلور گو درست ہو لیکن ضرور کیا ۔۔۔ خواہی نخواہی اس کو غزل میں کھپائیے
دستور و نور و طور یہ ہیں قافیے بہت ۔۔۔ اسمیں جو چاہیئے تو قصیدہ سنائیے

(مؤلف) انشا نے تو اعتراض کر ہی دیا۔ مگر اعتراض کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی۔ مصحفی کا مقصد تو یہ ہے کہ صانع نے تیری گردن ایسی بنائی ہے کہ اوس کی صفائی بلور کی سی ہے اور وہ بلوری معلوم ہوتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے خود انشا نے بھی کہا ہے۔ کہ بلور اگرچہ درست ہے مگر شعر میں باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلوریں گردن کی کوئی مثال میرے ذہن میں نہیں ہے مگر میں نے اس کی مثالیں اور نظیریں دیکھی ضرور ہیں۔ مگر ساق بلوریں کی مثالیں تو سبھی نے دیکھی ہوں گی۔ ایک شعر آتش کا اس وقت بھی مجھے یاد ہے

ساعد سیمیں تو ہیں الماس کے ترشے ہوئے ۔۔۔ اک نظر ساق بلوریں بھی دکھایا چاہئے

شیخ مصحفی نے خیال کیا ہے کہ انشا کا اعتراض بلور پر اس لئے ہے کہ یہ لفظ مشدد درست نہیں ہے اسی واسطے انھوں نے یہ جواب دیا ہے ؎

خم ہوتی ہے کوئی مری بلور کی گردن ۔۔۔ یہ لفظ مشدد بھی درست آیا ہے مجھ سے

مصحفی ؎ سرمشک کا ہی تیرا تو کافور کی گردن ۔۔۔ نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اعتراض انشا ؎ کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھکر ۔۔۔ مردے کی باس ڈھنڈے کو لا کر سنگھائیے
یوں خاطر شریف میں گذرا کہ بزم میں ۔۔۔ کھلا ہوا شریفہ غزل کو بنائیے

(مؤلف) اس اعتراض کو انشاء کی ظرافت اور خوش طبعی کی طرف منسوب کریں تو سب کچھ ہے اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کوئی غور

سے بد۔ بیچاری کے قصاید کی تشبیہات و استعارات کو دیکھیے تو نہ معلوم مرحوم معترض کی زبردستی پر اُسے کتنی ہنسی آئے۔ مصحفی نے خود اس کا یوں جواب دیا ہے جواب مصحفی ؎

کافور سے مطلب ہے مرا اس کی سفیدی ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن

مصحفی ؎ مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے دو ہاتھ میں ماہئ سقنقور کی گردن

اعتراض انشا ؎ گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے

جواب مصحفی ؎ میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن

(مؤلف) انشا کا اعتراض یہ ہے کہ سقنقور کی گردن کیوں لکھا۔ مصحفی یہ کہتے ہیں کہ اعتراض میں تم نے مجرد سقنقور کیوں لکھا ماہئ سقنقور لکھا جاتا ہے یا یہ کہ مصحفی کی غزل کے جواب میں انشا نے جو غزل کہی تھی اوس میں انھوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

مچھلی ہوئی ورزش سے ترے ڈنڈ پہ مچھلی ہر نام خدا جیسے سقنقور کی گردن۔

مگر یہ انشا پر اعتراض ہو سکتا ہے مگر ایسے انشار کے اعتراض کا جواب نہیں کہا جا سکتا۔ میرے نزدیک اعتراض صحیح ہے۔ اگرچہ خود بھی اس غلطی میں مبتلا ہوئے ہیں اور مصحفی سے زیادہ ماہی سقنقور ایک مچھلی ہوتی ہے۔ جو خشکی میں رہتی ہے بعض کے نزدیک ماہئ زریں بھی اسی کو کہتے ہیں۔ صرف سقنقور کے معنی ایک گزندہ جانور کے بتاتے ہیں۔ اور غالباً وہ گوہ۔ ہے۔

مصحفی کے اسی شعر پر سید انشار کا یہ بھی اعتراض تھا کہ ماہی کو مسند دلکھنا درست نہیں ہے۔ چنانچہ تعریض کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مشفق کڑوی کمان کو کڑوی نہ بولئے چلّے کے مفت تیر ملامت نہ کھائیے

اُردو کی بولی ہے یہ بھلا کھائیے قسم اس بات پر اب آپ ہی مصحف اٹھائیے

شیخ مصحفی نے اس کے جواب میں سنداً کسی استاد کا یہ شعر پیش کیا

مائیم و فقیری و سیہ روئی دو کونین زخسار سفید اُمرا را نہ شناسیم

اعتراضات بر مصحفی از شاگرد سودا[1]

سودا کے ایک قصیدے پر مصحفی نے کچھ اعتراضات کئے تھے۔ اسی پر سودا کے ایک شاگرد نے مصحفی کے ایک قصیدے کی تشبیب پر اعتراض کئے۔ چنانچہ مصحفی کا ایک شعر یہ ہے

مصحفی ؎ گر باز معانی کا مرے ہووے ہوا گیر پیدا کریں احرار ہوا حکم عصافیر

---

[1] ان کا نام وحال معلوم نہیں ہو سکا

اعتراض سے

احرار و معانی کو کیا تو نے ہے یک جا — ہرگز کسی استاد کو سوجھی نہ یہ تدبیر
بولا کوئی استاد نہ اسطرح سے اک لفظ — جو کچھ ہے معانی کے بیاں میں تری تقریر
بولے ہیں معانی کو ہزاروں جگہ استاد — طائر بھی کہہ اور مرغ بھی اور وحشی و نخچیر
لیکن کہیں احرار ہوا کو نہیں لائے — دی کتنی ہی معنی کے تئیں شوکت و تقریر
استاد زبردست جو گزرے ہیں انھوں نے — با فکر متین و بخیالات و بہ تدبیر
تھے عرش پہ جو بال کشا مرغ معانی — لفظوں کا بچھا دام کیا ان کو گرہ گیر
اندیشہ کو شاہین و خیال اپنے کو شہباز — وہ کہہ گئے اس فن کے جو تھے موجد تقریر
معنی ہے شکار اور خیال انکا ہے صیاد — خود صید سے ہر چند معانی ہو ہوا گیر
اس بازِ معانی کے اڑانے سے تو باز آ — اور جانوروں پر اسے زنہار نہ کر شیر
معنی کو اڑاتا ہے کوئی جانوروں پر — میں فرض کیا یہ کہ ترا باز ہوا شیر
احرار ہوا سے جو عصافیر کو خارج — کرتا ہے عصافیر نے کیا کی تری تقصیر
جتنے کہ ہیں طائر وہ سب احرار ہوا ہیں — آفاق میں سیمرغ سے لے تا بہ عصافیر
تو نے تو معانی کا نیا باز اوڑایا — تا پکڑے تو اس باز سے احرار ہوا گیر

(مؤلف) معترض نے اس شعر پر کئی اعتراض کئے ہیں۔ ایک یہ کہ شعرا معانی کو نخچیر لکھتے ہیں اور اپنے خیال و اندیشہ کو باز یا شاہین لکھتے ہیں۔ پھر انھوں نے معانی کو باز کیونکر لکھا۔ دوسرے یہ کہ احرار ہوا میں عصافیر بھی ہیں ان کو کیوں احرار سے خارج کیا تیسرے یہ کہ احرار و معانی کو ایک جگہ کیوں لکھا۔ پہلے دو اعتراضوں کی سنگینی میں کلام نہیں۔ اگرچہ پہلے اعتراض میں معانی کو باز کا مستعار منہ ان کر اور دوسرے میں عصافیر کو بلحاظ موقع عاجز اور کمزور کے معنے میں جانکر جواب اور تاویل کی خاصی گنجایش نکل آئیگی۔ مگر انصاف پسندی کے لئے تاویل بہرحال تاویل اور قال وقیل بہرصورت قال وقیل ہے۔ تیسرے اعتراض کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی

مصحفی سے

اور باندھوں ہوں جب شست نشانہ پہ سخن کے — رہ جائے ہی منھ دیکھ مرا دیدۂ زہ گیر

اعتراض سے

یہ شست نشانے پہ جو باندھی ہی سخن کے — ہے اس میں طبایع کو تردد بجا ہیر
اس مصرع بے ربط کے معنے نہیں سمجھے — رہ جائے ہے منہ دیکھ مرا دیدۂ زہ گیر
زہ گیر کے منہ دیکھ کے رہ جانے سے تیرے — کیا پائی تری شاعری و شعر نے توقیر
بہتر تھا کہ کر دیتا ارادے کی تو اپنے — اس شعر کے ساتھ حاشیہ میں شرح بھی تحریر

(مؤلف) اعتراض بالکل صحیح ہے اول تو مصرع ثانی شیخ مصحفی کے شعر میں بیکار ہے۔ اگر کھینچ تان کر معنے پیدا کئے جائیں

تو پھر وہی دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دہ' زہ گیر منہ دیکھ کے رہ بھی جاتا ہے تو اس سے شعر میں کیا افزونی ہوجاتی ہے۔

مصحفی ~ مصرع کو بصد خون جگر مصرع سے چسپاں — کرتے ہیں تو پھر وہ بھی دو پلکے کی ہے تعمیر

اعتراض ~ مصرع سے بصد خون جگر مصرع کو چسپاں — مصرع یہ عجب پوچ تو لایا ہے یہ تسطیر

مصرع کا جو مصرع میں ترے لفظ ہے ای کو — عین اس میں سماتا نہیں ہرگز کسی تقدیر

(مولف) اعتراض صحیح ہے۔ مصحفی کے یہاں عین تقطیع سے ساقط ہے۔ اس سے ان لوگوں کو سبق عبرت لینا چاہیے جو یہ کہتے ہیں کہ پہلے لوگ حروف کے تقطیع سے ساقط ہونے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مرزا باقر در رنگین

رنگین نے مجالس رنگیں میں لکھا ہے۔ کہ دلی میں ایک مرتبہ ہم اور بھائی سبحان قلی بیگ اور بہت سے آدمی شادی کی محفل میں جمع تھے۔ کہ رباعیات فارسی کا ذکر چھڑ گیا۔ ہر کوئی اساتذہ میں سے ایک ایک دو دو رباعیاں سنانے لگا۔ مرزا موصوف نے اپنے اُستاد مرزا باقر بہادر جنگ کی یہ رُباعی سنائی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب اس سے بہتر رُباعی کہنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس پر اعتراض کیا۔ رباعی یہ تھی

مرزا باقر ~ در دشت بجستجوئے لیلےٰ می گشت — مجنوں بہوائے روئے لیلےٰ در دشت

مے گشت ہمیشہ بر زبانش لیلےٰ — لیلےٰ می گفت تا زبانش مے گشت

اعتراض رنگین۔ می گشت کا قافیہ دونوں شعروں میں آیا ہے۔ دوسرے اور پہلے میں ایک ہی معنی ہیں اور کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید دوسری جگہ می گشت کے معنے یہ ہیں کہ جب تک قید حیات میں تھی

(مؤلف) مراد یہ ہے کہ رباعی میں تینوں قافیے علٰحدہ علٰحدہ ہونا چاہئیں۔ یہ اعتراض صحیح ہے اور دوبارہ جو توجیہ کی گئی وہ عذر بادر کا درجہ رکھتی ہے۔ زبانش مے گشت کے معنے قید حیات کے نہیں لئے جا سکتے۔ ہاں اگر اس مے گشت کے معنی یہ لیتے کہ جب تک اوس کی زبان لوٹتی تھی وہ لیلےٰ لیلےٰ کہے جاتا تو بات بن جاتی۔ زبان لوٹنا زبان کا الفاظ کو ادا کر سکنے کے معنی دیتا ہے

میر محمد زماں راسخ سرہندی و معترضین

مولانا آزاد مرحوم نے تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں حاکم لاہوری کی زبانی یہ نقل بیان کی ہے۔ کہ ایک مرتبہ میر جمال الدین اور میر فخر الدین حسین لاہوری کے مکان پر لاہور میں مجلس شعر و سخن گرم تھی۔ اوسی مجمع میں میر محمد زماں راسخ سرہندی بھی تھے شعر خوانی ہو رہی تھی۔ راسخ مرحوم نے ایک شعر پڑھا۔ لوگوں نے اعتراض کیا

میر محمد زماں ناسخ ؎ جامۂ صبر بہ بالائے جنوں تنگ آمد انچہ از دست بر آمد بگریباں کردیم

معترضین۔ جامہ قد پر کوتاہ ہوتا ہے نہ کہ تنگ۔

جواب شاہ آفریں۔ میر صاحب کا شعر بالکل درست ہے جامہ قد پر تنگ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ ہاتفی ظفرنامہ میں لکھتا ہے

نہ ہندی عناں تافت از راہ جنگ نہ بر قامت ترک شد جامہ تنگ

(مؤلف) جواب صحیح ہے تنگ کے معنے بھی کوتاہ ہی کے ہیں۔ اور قد کے لئے جب تنگ لکھیں گے۔ اوس کے یہی معنے لئے جائیں گے۔ اور کچھ نہیں

منشی محمد اسماعیل حسن صاحب منیر و مولوی عصمت اللہ صاحب شاگرد ناسخ

اسم گرامی منشی محمد اسماعیل حسن تھا۔ شکوہ آباد کے رہنے والے تھے۔ ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے مگر ناسخ نے اپنے تذکرہ میں رشک کا شاگرد لکھا ہے بہر حال آپ ایک جلیل القدر اور کامل الفن شاعر تھے اول اول میں نواب صاحب باندہ کی سرکار کے نمک خوار تھے۔ کہ غدر ۱۸۵۷ء کا زمانہ آیا اور اسی زمانہ میں آپ بھی قید فرنگ کی ہوا کھانے پر مجبور رہوئے مگر آخر رہائی پائی اور دربار رامپور کے متوسلین میں داخل ہوئے۔ اور اس بہانہ سے باقی عمر بخوشی و خرمی بسر ہوگئی۔ مثنوی سراج المضامین اور سراج منیر آپ کی یادگار ہیں۔ نہایت بہتر سخن سنج تھے اور اپنے زمانہ کے قادر الکلام شعراء میں آپ کا شمار تھا۔ لکھنؤ کے دیگر شعراء کے سلسلہ میں مولوی عصمت اللہ شاگرد ناسخ نے آپ پر بھی اعتراض کئے تھے جو ذیل میں درج ہیں

منیر ؎ فصل گل آئی ہے مبروص ہوئی لیلیٰ شب قیس خفاش کی الفت میں نہ آجائے خلل

اعتراض۔ جب مصنف صاحب جدت مضمون کی طرف آجاتے ہیں تو ایسا ہی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے ہزاروں مہمل شعر اُن کے دیوان میں بھرے ہوئے ہیں جس کی نسبت اہالیان لکھنؤ کو طرز شوکت بخاری کا گمان ہے

جواب مولوی آغا علی۔ میں نے سُنا ہے کہ رامپور میں آپ نے منشی صاحب سے مباحثہ میں کئی بار نیچا دیکھا۔ شاید وہی دل کے پھپھولے آپ نے یہاں پھوڑے۔ ورنہ شعر تو ایسا ہے کہ سیکڑوں دفتر الٹ ڈالئے ایک بھی نہ نکلے گا۔ آپ کے انکار سے شعر کا مرتبہ اہل نگاہ کی نظر میں کم نہیں ہوسکتا

(مؤلف) مولوی آغا علی صاحب نے جس واقعہ تاریخی کا ذکر کیا ہے کہ مولوی عصمت اللہ اور منیر سے مباحثہ ہوا۔ یہ کسی دفتر تاریخ میں لکھنے کے قابل ہو تو ہو۔ مگر جواب دیتے ہوئے یہ کہنا تو عجز کی سی دلیل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معترض کے اعتراض کا جواب دینے کے بجائے لوگوں سے اعتراض کا سبب بتانا شاید اپنی طرف متوجہ کرنے سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ رہی یہ بات کہ دفتر کے دفتر الٹ ڈالئے تب بھی ایسا شعر نہ نکلے۔ اس جواب کا میں بھی قایل ہوں

منیر ؎ ہوا اشارۂ حضرت سے چاند دو ٹکڑے   ہوا نہ کوچۂ شق القمر میں کی رفتار

اعتراض۔ ہوا کا کوچۂ شق القمر میں رفتار کرنا کیا۔ مصرع دوم مہمل ہے

جواب۔ رفتار ہوا اجرام قمر کے اندر دلیل اوس کے شق ہونے کی ہے۔ مصرع دوم کو مہمل بھی مہمل نہ کہے گا

(مؤلف) مجیب نے معترض کے اعتراض پر غور نہیں کیا۔ بلکہ بغیر سمجھے جواب دیدیا۔ اعتراض یہ ہے کہ ہوا کا رفتار کرنا کیا معنے یہ غلط ہے رفتار کرنا اردو کا محاورہ نہیں ہے۔ اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں

منیر ؎ قند مصنوع سے ہو زہر عداوت شیریں   باغباں میٹھی چھری سے جو تراشے حنظل

اعتراض۔ شاید قند غیر مصنوع بھی ہوتا ہے۔ ورنہ مصنوع کی خصوصیت کیوں ہے

جواب۔ مصنوع کہنے سے غیر مصنوع کا وجود نہیں لازم آتا۔ کیا خدائے قہار کہنے سے یہ لازم آتا ہے کہ خدائے جبار اور ہے۔ سعدی ؎

آتش سوزاں نکند با سپند   آنچہ کند دود دل دردمند

کیا آتش غیر سوزاں بھی ہوتی ہے

(مؤلف) جو جواب دیا گیا ہے یہ جواب نہیں ہے۔ بلکہ اس جواب نے شعر کو مہمل بنا دیا۔ جواب یہ ہو سکتا ہے کہ قند نام ہے ایک شیرینی کا۔ اوسی قند کو جب اور زیادہ بنایا جاتا ہے تو وہ نبات ہوتی ہے۔ یا قند کرر کی صورت اختیار کرتی ہے ورنہ قند بجائے خود قند ہے اور وہ ایک مستقل نام ہے۔ شعر صحیح ہے اعتراض نافہمی پر مبنی ہے

منیر ؎ نہ دیکھے آپ کو جس سال موسم حج میں   سیاہ پوش ہو کعبہ کمر شکستہ حطیم

اعتراض۔ کعبہ تو ہمیشہ سیاہ پوش رہتا ہی ہے

جواب۔ یہاں سیاہ پوش بمعنی ماتمدار آیا ہے

(مؤلف) جواب صحیح ہے

منیر ؎ رکھتے ہیں اور صنعتوں میں بھی   قاری آغا علی نمود اری

اعتراض۔ نمود اری رکھنا کہاں کا محاورہ ہے سند چاہئے

جواب۔ یہ لکھنؤ کا محاورہ ہے اور اسی شعر کو سند سمجھئے۔ اس واسطے کہ منیر اہل زبان تھے۔ زبانداں کے واسطے اہل زبان کا شعر سنداً کافی ہے

(مؤلف) یہ جواب بالکل غلط ہے نمود اری رکھنا کوئی محاورہ نہیں ہے

منیر ؎ حسین ایسے ہیں سقّے کہ وقت آب کشی فروغ عکس سے یوسف نشیں بنا ہر ڈول

اعتراض۔ یوسف نشیں کی ترکیب ایجاد مصنف ہے سند چاہیئے

جواب۔ ترکیب تو قدیم ہے یوسف البتہ نیا ہے۔ سلمان ساوجی ؎

جائے شاہانست یارب فرخ و فرخندہ باد جاوداں بر بادشاہ شہ نشاں ایں شہ نشیں

اس شہ نشیں کو ملاحظہ کیجئے جو اس کی ترکیب ہے وہی یوسف نشیں کی بھی ترکیب ہے

(مؤلف) سبحان اللہ فاضل مجیب نے کس آسانی اور لاپرواہی کے ساتھ یہ جواب دیدیا کہ شہ نشین۔ اور یوسف نشیں کی ترکیب ایک ہے۔ میرے نزدیک مصنف کی مراد یہ ہے کہ سقّے اسقدر حسین وجمیل ہیں کہ وہ یوسف معلوم ہوتے ہیں۔ اور پانی کھینچتے وقت جو ڈول کے پانی میں ان کا عکس پڑتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ڈول میں ایک یوسف بیٹھا ہے یوسف کا ڈول میں ہونا تلمیح ہے قصۂ حضرت یوسف کی۔ میرے بھی یہاں اوسی طرح عکس کو یوسف۔ اور ڈول کو یوسف نشیں قرار دیا ہے۔ مجیب نے شہ نشیں کے مانند یوسف نشیں کو بھی قرار دیا ہے۔ اور ترکیب کے لحاظ سے اس کو غلط کہا بھی نہیں جاسکتا۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ یوسف نشیں کی ترکیب کی کہیں دنیائے ادب میں سند بھی مل سکتی ہے یا نہیں اس کا جواب نفی میں ہے۔ اور جب جواب نفی میں ہے تو معترض کا اعتراض کرسی نشیں ہے

منیر ؎ موجود راتدن ہیں اطاعت میں گرم و سرد حمامی آفتاب ہے اور آبدار چاند

اعتراض۔ کیا مصنف نے گرم و سرد کو مثل سیاہ وسفید رُطب ویابس تروخشک کے استعمال کیا ہے یہ درست نہیں

جواب۔ یہاں تسمیۂ سبب باسم مسبب ہے۔ گرم و سرد بمعنی رطب ویابس نہیں ہے بلکہ گرم سے مراد آفتاب ہے اور سرد سے ماہتاب اور یہ مراد مصنف کی دوسرے مصرع سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے

(مؤلف) جواب صحیح مانا جاسکتا ہے۔ مگر گرم و سرد پھر بھی اچھا نہیں ہے

منیر ؎ گل داغ جگر پائے شگفتہ طبع دنیا میں بجز زخم جبیں کوئی نہیں ہے خندہ پیشانی

اعتراض۔ مصرع ثانی مہمل ہے

جواب۔ جب غنچہ کا مسکرانا اور گل کا ہنسنا درست ہے تو زخم جبیں کا خندہ پیشانی ہونا کیوں درست نہیں اور اگر یہ استعارہ درست ہے تو مصرع ثانی مہمل کیوں ہے

(مؤلف) جواب صحیح ہے۔ معترض کے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ میرے نزدیک اگر پہلے مصرع کو مہمل کہا جاتا تو درست ہوتا اس لئے گل داغ کا طبع دنیا میں شگفتہ ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا

منیر ؎ اگرچہ گندمی رنگوں کو بیسا اس جزیرہ نے نہ پائی ایک دن بھی آردِ گندم نے ارزانی

اعتراض ۔ لفظ آرد کے حرف (را) کو کس قاعدہ سے متحرک کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اُستاد مرزا سلامت علی صاحب دبیر نے مصرعۂ مندرجۂ ذیل میں کارد کا حرف را متحرک کیا ہے

شرط یہ ہے کہ کارد نہ دکھا دُاس کو

جواب ۔ وزن میں متحرک ہو جانا ایسے حروف کا ممنوع نہیں ہے ۔ حافظ ؎

خوبان پارسی گو بخشندگانِ عمر اند ساقی بشارتے دہ پیران پارسارا

جو حالت یہاں پارسی گو میں حرف را کی ہے وہی شعر منیر میں آرد کے حرف را کی ہے

(مؤلف) ساکن کو متحرک کرنا شاعر کے لئے صرف وزن تقطیع کے درست کرنے کے لئے جائز ہے ۔ نہ کہ ظاہرا شعر میں متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دینے کی اجازت ہے

منیر ؎ ادہر رکابیں بنیں عرش کے تلے قوسین اُدہر غزالِ حرم سایۂ حواس شکار

اعتراض ۔ سایۂ حواس شکار کے کیا معنے ۔ مصرع ثانی مہمل ہے

جواب ۔ مصرع مہمل کیوں ہے ۔ یہ شعر بُراق کی تعریف میں ہے ۔ اور حواس شکار اوس کے سایہ کی صفت ہے یعنی بُراق کا سایہ ایسا تھا کہ حواس کو شکار کرتا تھا ۔ یعنی حواس اوس کی ماہیت کی دریافت میں عاجز و مغلوب تھے

(مؤلف) حواس شکار کی ترکیب غلط تو نہ تھی مگر جناب مجیب نے غلط کر دی ۔ انھوں نے پہلے یہ جواب دیا ہے کہ براق کا سایہ ایسا تھا کہ حواس کو شکار کرتا تھا ۔ اور پھر تشریح یہ فرمائی ہے کہ ۔ یعنی حواس اوس کی ماہیت کی دریافت میں عاجز و مغلوب تھے پہلے فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حواس کو مفعول قرار دیا گیا ہے ۔ اور دوسری توجیہ سے حواس کو فاعل ٹھیرایا ہے ۔ جب حواس اوس کی ماہیت دریافت کرنے سے عاجز تھے تو حواس شکاری ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کا سایہ دسترس شکار حواس سے باہر تھا ۔ نہ یہ کہ اوسکا سایہ حواس کو شکار کرتا تھا ۔ میرے نزدیک مصنف کا مطلب نہ حضرت معترض نے سمجھا ۔ اور نہ جناب مجیب نے ۔

مصنف تقابل کے طریق پر کہتا ہے کہ ادس طرف تو اوس کی رکابوں کے سایہ سے یا خود رکابوں سے قوسین بنیں اُس طرف سے مراد بالائے آسمان یا عرش ۔ اور اسی کے مقابلہ میں ادہر غزال حرم حواس شکار کے سایہ کی طرح معلوم ہوتے گے ۔ یعنی جیسے کہ شکار بھاگا جا رہا ہو اور اس کا سایہ پڑ رہا ہو اسی طرح حواس شکار کا سایہ یہ آہوان حرم بن گئے ۔ مصنف کمال نزاکت مضمون کی وجہ سے شکار کا سایہ آہوان حرم کو نہیں کہتا بلکہ حواس شکار کا سایہ کہتا ہے ۔ اور شکار کے حواس چونکہ شکار سے بھی زیادہ بھاگنے والے ہوتے ہیں اس واسطے آہوانِ حرم کو ان کا سایہ کہنا مناسب تھا

منیر ؎ کنار رحل میں جس طرح رحل کا اظہار ضیائے ریش مقدس سے چہرۂ انور

اعتراض - اظہار کا استعمال اس طرح پر غلط ہے - شاید مصنف نے اپنے استاد مرزا دبیر کی تقلید کی ہے

جواب - اظہار کے اس طرح پر استعمال کرنے میں از روئے لغت کوئی غلطی نہیں - ہاں یہ البتہ ہے کہ اس طرح پر فصحائے ہند نے بندرت استعمال کیا ہے

(مؤلف) اگرچہ دبی زبان سے مجیب نے اس اعتراض کو مان لیا ہے مگر صاف نہیں کہا کہ غلط ہے - یہ کہنا کہ از روئے لغت کوئی غلطی نہیں قطعاً غلط ہے - اس واسطے کہ یہاں مصدر لازم کی ضرورت ہے نہ کہ متعدی کی - لہٰذا اظہار کے بجائے ظہور کہنا چاہئے تھا - اردو میں کسی کے یہاں اس طرح اگر نکل بھی آئے تو وہ غلط ہوگا - اکثر ایسا ہوا ہے کہ اساتذہ اردو کے یہاں عربی مصادر کا استعمال برمحل نہیں ہو سکا - مگر وہ سند نہیں ٹھیر سکتے

مرزا فاخر مکین و سودا

مرزا فاخر مکین ؎ من گدائے خویش کردم بادشاہ خویش را راستی من یاد دادم کجکلاہ خویش را

اعتراض سودا - اس شعر کے معنی میں کوئی لطف نہیں - فرض کیجئے کہ عاشق نے معشوق کو راستی کی یاد دلاہی دی - مگر اس سے کیا ہوتا ہے راستی کے یاد دلانے سے شاہ گدا نہیں ہو سکتا - معشوق کی کج کلاہی اچھی معلوم ہوتی ہے نہ کہ راستی اگر یہی مراد ہے تو کوئی لطف نہیں ہے

(مؤلف) میرے نزدیک یہ شعر کسی نہ کسی طرح مسخ ہو گیا ہے - اگر در اصل یوں ہی تھا تو کچھ لطیف نہیں ہے سودا کا اعتراض اس لحاظ سے صحیح ہے - مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس سے بادشاہ گدا کیونکر ہو گیا - اس سے مراد یہ ہے کہ عاشق نے معشوق کو راستی کی تعلیم دی - اس سے وہ عاشق کا محتاج ہوا - اور یہی احتیاج ایک بادشاہ کے لئے گدائی کا مرتبہ رکھتی ہے - اس صورت میں تشبیہ بہ ادنےٰ ملابست پیدا ہو گئی جو تمام فصحاء کے نزدیک جائز ہے

مکین ؎ ساقی گرفت ساغر مرد آزمائے ما زن سیرتان دور جہاں را خبر کنند

اعتراض مرزا سودا - زن سیرتوں کی مردانگی کا دعوے پہلے ثابت کرنا چاہئے تھا - اوس کے بعد ساغر مرد آزما اُن کو دیا جاتا - وہ غریب مردانگی کا دعوے ہی کب کرتے ہیں - دوسرے یہ کہ جس کے ہاتھ میں ساغر مرد آزما ہے اس کو چاہئے کہ اُن کو صلا دے جو مردانگی کا دعوے رکھتے ہوں نہ کہ زن سیرتوں کو - اور لفظ آزمائے کا بھی یہی فائدہ ہے جیسا کہ نظیری نیشاپوری کے اس شعر میں

کار نظیری در رضا غم خوردن و خوش بودن است دارم مے مرد آزما خوش باد شیخ و شاب را

نظیری کا مقصد یہ ہے کہ نظیری کا کام رضائے الٰہی میں غم کھانے اور خوش رہنے کا ہے۔ یہ حالت ایک مئے مرد آزما ہے۔ اس کے بعد شیخ وشاب سے خطاب ہے کہ جس کو دعوے ہو وہ آئے۔ اس طرح نہیں ہے جیسے مرزا فاخر مکین نے کہدیا ہے کہ ساقی مئے مرد آزما لے کر زن سیرتوں کو آواز دے رہا ہے۔ شیخ ابوالفیض فیضی کا بھی یہ شعر ہے

گرد فنا شد ند حریفان بزم عشق برخاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو حریف مئے مرد آزما کے پینے کا حوصلہ رکھتے تھے وہ فنا ہو گئے۔ اسی لئے ساقی سے کہتا ہے کہ شراب مرد آزما کو خاک پر گرا دے۔ غرض یہ کہ نظیری مئے مرد آزما کے لئے شیخ وشاب کو صلا دیتے ہیں کہ جس میں طاقت ہو وہ آئے اور پئے۔ اور فیضی کہتے ہیں کہ حریف گرد فنا ہو گئے کوئی باقی نہیں رہا کہ اس شراب کو پی سکے۔ ان دونوں کی تو یہ کیفیت ہے۔ نہ معلوم مرزا صاحب کس سند پر ساغر مئے مرد آزما لے کر زن سیرتوں کو صلا دے رہے ہیں۔ اس صورت میں جاہل سے جاہل پر بھی یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ مرزا مکین کی شاعری نظیری اور فیضی کے مقابلہ میں ذرہ اور آفتاب کی بھی نسبت نہیں رکھتی اگر وہ دونوں شاعر بھی زن سیرتوں کو ساغر مرد آزما کے پینے کا اہل جانتے تو اپنے اپنے شعروں میں کیوں نہ کہتے۔ اس مضمون کو مکین صاحب کے لئے کیوں چھوڑ جاتے کہ وہ ساغر مرد آزما پینے کے لئے زن سیرتوں میں صدائے بے ہنگام لگاتے پھرتے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیرت مرزا صاحب ہی کی ہے کہ مرد آزما ساغر پر زن سیرتوں کو بلائیں۔ یہ صرف رعایت الفاظ ہے کہ مرد لائے تھے تو زن بھی لائے ہمارے نزدیک تو اس شعر کے معنی سمجھنے کی جو کوشش کرے وہ بھی بیوقوف ہے

(مؤلف) مرزا سودا نے اپنے نقطۂ نظر سے جو اعتراضات کئے اور فیضی و نظیری کی جو نظیریں لائے ہیں وہ درست ہیں مگر حق تو یہ ہے کہ مرزا فاخر مکین کے مقصد کو نہیں سمجھے اور ان کے معنے کو نہیں پہونچے۔ اور اس لحاظ سے اعتراض بے معنی ہے۔ میرے نزدیک مکین کے شعر کے معنے یہ ہیں۔ کہ زمانہ میں جتنے زن سیرت مخنث نما بھرے ہوئے ہیں اون کو آگاہ کردو کہ اب ساقی نے ساغر مئے مرد آزما ہاتھ میں لیا ہے۔ زن سیرتی کا دور گزر گیا مرد بنو۔ اور مردوں کی سیرت اختیار کرو۔ وہ زن سیرتوں کو نہیں چاہتا۔ اوس کی شراب مردوں کے لئے ہے

مرزا فاخر ؎ از مدار اگرچہ کام دل نشد حاصل ولے خاطر یار و دل دشمن بدست آمد مرا

اعتراض مرزا سودا۔ مرزا صاحب نے غالباً اس شعر کے یہ معنے رکھے ہیں۔ کہ یار کا مقصد یہ تھا کہ ہم تمنا کو ترک کر دیں۔ لہٰذا ہم نے اسی پر صلح کر لی اور اپنے مقصد سے دست بردار ہو گئے۔ اس سے اپنا مقصد تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ دشمن اور دوست دونوں ہم سے راضی ہو گئے۔ لیکن اب ہم پوچھتے ہیں کہ جب دوست اور دشمن کا دل حاصل کر لیا تو حصول مقصد دل میں کون سا عقدہ باقی رہ گیا۔ اس صورت میں جو تمنا کہ عاشق کے دل میں

ہوگی معشوق اُس کو پورا کرے گا۔ چنانچہ تشبیہی کاشی اسی قسم کا ایک شعر کہتا ہے ؎

در رضائے یار تشبیہی حصول مدعا است — کام دل حاصل شود خاطر بدست آوردہ را

یا

یار و غیر و چشم من کردند باہم اختلاط — آفتاب و ذرہ و روزن بدست آمد مرا

اگرچہ آفتاب اور ذرہ اور روزن ایک ساتھ حاصل کرنا اور ہاتھ میں رکھنا خرق عادت سے کم نہیں ہے۔ تاہم معنے کا لطف لف و نشر مرتب کے سوائے اس شعر میں موجود ہے

(مؤلف) مرزا نے ایک منطقی اعتراض پیش کر دیا ہے ہرچند کہ شعر ایک لطف شاعرانہ کیلئے کہا گیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ مُدارا سے کوئی کام اپنا تو نہیں بنا پھر بھی اتنا تو ضرور ہوا کہ دوست دشمن سب اپنے ہو گئے۔ غضب یہ ہوا ہے کہ مرزا نے شاید مُدارا کے معنے صلح کیلئے ہیں۔ اور یہاں رعایت کرنے کے معنی ہیں یہ شعر بالکل ایسا ہے جیسے حافظ کا یہ شعر

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است — با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

مدارا کے معنے رعایت کے مولانا روم کے اس شعر میں بھی ہیں

لطف حق با تو مدارا ہا کند — چونکہ از حد بگزرد رسوا کند

یا صائب کے اس شعر میں ؎

شکستن کمر کوہ قاف چنداں نیست — بمور ہر کہ مدارا کند سلیماں است

مرزا فاخر مکین ؎ — پا بہر جانب نہادم در شہادت گاہ عشق — از تو شمشیر و ز خود گردن بدست آمد مرا

اعتراض میرزا سودا۔ میرے خیال میں مرزا صاحب کا یہ شعر کہنے سے منشاء کچھ اور ہے۔ بہرحال معنی تحت لفظی یہ ہیں کہ مرزا صاحب نے جہاں قدم رکھا چند گردنیں اور چند تلواریں ہاتھ میں آئیں۔ اور یہ نہیں سمجھے کہ یہاں بدست آمد مرا کا موقع نہیں ہے۔ بلکہ نظر آنے کا محل ہے

(مؤلف) میرے نزدیک یہ اعتراض صحیح ہے۔ بدست آمد مرا کے معنے اگرچہ مرزا فاخر نے بنظر آمد مرا کے لئے ہیں مگر صحیح نہیں ہیں کسی بزرگ کا یہ شعر اسی مضمون کا ہے اور انہوں نے بہت صحیح طور سے کہا ہے ؎

گزر بکوچۂ سفاک مشکل افتاد است — بہر کجا کہ قدم مے نہم دل افتاد است

اُردو میں بھی شاید منشی امیر احمد صاحب کا ایک شعر ہے جس کا مصرع ثانی یہ ہے

. . . . — قدم کوئی کہاں رکھے جدھر دیکھو ادھر دل ہے

مرزا فاخر مکین ؎ — گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دل من — شگفتہ روئے صہبا شگفتہ کرد مرا

اعتراض مرزا سودا- اگر در اصل قدح میں گرفتگی کی صورت ہوتی تو دل کی گرفتگی کو اُس کے ساتھ تشبیہ دیتے شعراء میں قدح کی تشبیہ گل کے ساتھ دی جایا کرتی ہے اور گل کی قدح کے ساتھ اور غنچہ کی صراحی کے ساتھ صراحی کی غنچہ کے ساتھ۔ اور اس کے علاوہ بھی۔ مرزا صاحب کو اساتذہ کے دواوین پر عبور ہے بہ ظاہر اصل قدح کو کہیں گرفتگی کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا ہوگا۔ اور اگر باذل کے اس شعر کو سند میں پیش کیا جائے

چہ انشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو بدل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو

تو اس شعر کا مآل مبالغہ ہے۔ یعنی باوصفیکہ قدح بہر صورت شگفتہ ہے تاہم بغیر تیرے دل گرفتہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر مرزا کا ارادہ یہ ہو کہ میرا دل اس بزم میں گرفتہ تھا اور شگفتہ روئی صہبا نے مانند قدح کے اُس کو شگفتہ کر دیا۔ تو اس صورت میں لفظ مرا بیکار ہے۔ اور اگر ارادہ اپنی ذات کی طرف ہے یعنی شگفتہ روئی صہبا نے مثل قدح کے مجکو شگفتہ کر دیا تو اس حالت میں دل من بیکار ہے بہر صورت

بندش عجیب دارد و مضمون تازہ است ایں شعر نیست میت ملا دو پیازہ است

(مؤلف) میرے نزدیک قدح کی تشبیہ دل گرفتہ کے ساتھ کہیں نہیں آئی ہے۔ باذل کے شعر میں تشبیہ نہیں ہے بلکہ اس میں تو یہ کہا گیا ہے کہ قدح شراب جو اسقدر شگفتہ ہوتا ہے وہ بھی مجھے دل گرفتہ کی طرح معلوم ہوتا ہے

مرزا فاخر مکین ؎ مکن پنہاں زمن گردسرت گردم بگو قاصد کہ از بہر رقیب آں مہ چہ پنہانی نوشت امشب

اعتراض سودا- کیا خط قاصد کے مشورے سے لکھا گیا ہے جو اس سے پوچھتے ہیں۔ وہ کیا بتا سکتا ہے۔ اگر پیام زبانی قاصد کو دیا جاتا تو پوچھنا صحیح ہوتا۔ نامے کے مضمون کی قاصد غریب کو کیا خبر ہے کہ وہ بتا دے کسی کا یہ شعر ہے ؎

چوں نامہ براں میروم از شہر بہ شہرے با من خبرے ہست و مرا ہیچ خبر نیست

(مؤلف) سودا کا یہ اعتراض بھی درست ہے۔ قاصد صرف قاصد ہوتا ہے اوس کی صلاح ومشورہ سے کوئی خط نہیں لکھا جاتا

مرزا فاخر ؎ طریق اہل خرابات و خانقاہ یکے است دو جادہ گر بہ بیاباں فتادہ راہ یکے است

اعتراض مرزا سودا- اہل خرابات کے طریقوں کو معتکفان خانقاہ کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔ مصرع اولیٰ میں جو لفظ طریق ہے اس نے دوسرے مصرع کو بھی ضائع کر دیا۔ اہل خانقاہ نماز پڑھتے ہیں اور ساکنان خرابات شراب پیتے ہیں حلال وحرام شرعی کی اہل خرابات کو نزدیک کوئی قدر ومنزلت نہیں ہے۔ اس شعر میں اگر طریق کی بجائے مآل اور راہ کے بجائے منزل ہوتا تو شعر درست ہوجاتا۔ چنانچہ مرزا معز فطرت کا یہ شعر ہمارے دعوے کی تصدیق کرتا ہے

تواں دیدا ز چراغاں ہائے کثرت وحدت اورا بود توحید صوری رنگ کفر آئینہ کیشاں را

(مؤلف) مرزا سودا کا اعتراض صحیح ہے۔ اور اصلاح بھی درست ہے۔ مگر مرزا معز فطرت کا جو شعر نظیر میں پیش کیا ہے یہ ہرگز
اون کے لئے مفید مطلب نہیں ٹھیر سکتا

مرزا فاخر ؎ مردم ز خون بخورم از غیرت دشنام او جان شیریں رفت و حرف تلخ او از دل نرفت

اعتراض مرزا سودا۔ اس شعر کی بنا شیریں اور تلخ کے الفاظ پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ نہیں دیکھا کہ شعر اس سے بے مزہ ہوا جاتا ہے۔ وہ عاشق تو اصل میں بڑا خوش نصیب ہے جس کو اس کا معشوق گالیاں دے۔ ہلالی کا یہ شعر دیکھو ؎

پیش تو دعا گفتم و دشنام شنیدم هرگز اثرے بہتر ازیں نیست دعا را

(مؤلف) یہ مرزا سودا کی زبردستی ہے کہ اگر ایک مضمون سب کہتے چلے آرہے ہیں وہی کہا جائے۔ مانا کہ سب شعرا یہ کہتے ہیں۔ کہ معشوق کی گالی عزیز ہوتی ہے مگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ ہم مرتے مرگئے مگر اوس کی گالی کی جو غیرت چڑھی تھی وہ آخر تک رہی۔ آخر اس میں اس نے کیا غلطی کی اور وہ کیوں مستوجب جرم و سزا قرار دیا گیا

مرزا فاخر ؎ ہمچو صبح و شفق از ذوق شہادت دل من بر سر کوئے بتاں تیغ و کفن را بر داشت

اعتراض مرزا سودا۔ کفن کی تشبیہ صبح کے ساتھ مسلمات سے ہے۔ مگر تیغ کی تشبیہ شفق کے ساتھ درست نہیں ہے چونکہ مرزا فاخر مکین اپنے آپ کو بڑا اہل نظر جانتے ہیں اس واسطے ممکن ہے کہ انھوں نے کہیں ایسی تشبیہ دیکھی ہو۔ ہمارے نزدیک خون آلودہ تلوار کی تشبیہ شفق سے دی جا سکتی ہے اور اس شعر میں تلوار کی خون آلودگی کہیں ثابت نہیں ہوتی۔ لہذا یہ تشبیہ غلط ہے۔ ممکن ہے کہ تلوار کے سرخ مخمل کے غلاف سے مراد لی گئی ہو

(مؤلف) اعتراض اس لحاظ سے صحیح ہے کہ یہاں خون آلودگی تیغ کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر اگر اد نے تعلق اور ملابست کی وجہ سے اس تشبیہ کو درست کہا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے

مرزا فاخر مکین ؎ در فقر و فاقہ میگزرد بے تو زندگی دور از تو عمر من ہمہ ماہ صیام گشت

اعتراض مرزا سودا۔ ماہ صیام میں روزہ رکھا کرتے ہیں۔ روزے کو کوئی فاقہ نہیں کہتا۔ عاشق کو بے خواب و خوری سے نسبت دیتے ہیں نہ کہ فقر و فاقہ سے۔ فقر و فاقہ فقرا کے لئے مستعمل ہے۔ عاشق کچھ بھی نہیں کھاتا پھر بھی خون جگر کھاتا ہے اس جگہ ماہ صیام سے بھی کوئی مطلب نہیں نکلتا

(مؤلف) میرے نزدیک بھی مرزا فاخر مکین کا یہ شعر مضحک ہے۔ اور سودا کے تمام اعتراضات صحیح اور درست ہیں۔

مرزا فاخر ؎ دست وپائے غیر را از گریہ رنگیں کردہ ام　　گل زدم امروز بر سر خار را ہ خویش را

اعتراض مرزا سودا۔ اس شعر سے جو کچھ کہ مدعا معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ناچاری کے سبب سے غیر کے ہاتھ پاؤں کو گریۂ خونی سے رنگین کیا۔ اور رقیب کو خار راہ ہے مگر اس کے سر پر بھی پھول لگائے۔ یعنی خوشامد کی۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ عالم عجز میں پاؤں پر گرا کرتے ہیں ہاتھوں پر گرنا کہیں نہیں سنا۔ پھر جب یہ بات ہے تو ہاتھ کیونکر رنگین ہو گئے۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنی آمد ورفت کے راستہ میں چونکہ میں خون رو یا اور اس راہ سے غیر بھی گزرتا ہے تو اس واسطے اُس کے ہاتھ پاؤں رنگین ہو گئے۔ اس صورت میں بھی غیر کے پاؤں رنگین ہونا درست نہیں ہاتھوں کا رنگین ہونا اب ثابت نہیں ہے سوائے اس کے کہ کوئی چوپایوں کی طرح رستہ چلے۔ مگر یہ طریقہ ہی جدا ہے۔ اور اگر ہندی محاورہ نظم کیا ہے تو بات ہی دوسری ہے

(مؤلف) دست وپا یہاں زاید ضرور ہے مگر برا نہیں معلوم ہوتا۔ اس قسم کے تصرفات شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں

مرزا فاخر ؎ گرچہ دلبر در لکنت اما حرف میگوید درست　　دل شکستن خاطر آزردن نمیداند کہ چیست

اعتراض مرزا سودا۔ یہ شعر اوس غزل میں کا ہے جس میں معشوق کو عالم طفلی میں قرار دیا ہے۔ اور تمام غزل میں یہی روش ہی ہے۔ ہم کو اس شعر کے مصرع اولے پر اعتراض ہے۔ صحیح بات ادا کرنے کو لکنت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جب کہ زبان سے درست بات نکلے تو لکنت کہاں رہے گی۔ اور اگر شاعر کی مراد لفظ درست سے یہ ہے کہ اوس کا قول وفعل درست ہے تو اس صورت میں یہ اعتراض پڑتا ہے کہ جس کو ایسا نادان کہا گیا ہے اور مصرع ثانی میں اوس کی نادانی کا اس قدر اظہار کیا ہے کہ بسبب کمی عمر کے آزردہ کرنا اور دل توڑنا نہیں جانتا تو اس کا قول وفعل درست کیونکر ہوگا۔ اسی قسم کے مضامین دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ شاپور

طفل است وبہ عاشق روشِ زیست نداند　　صد جاں اگر از کس طلبد نیست نداند
دلدار نداند دل ما از دل اغیار　　داند کہ دل است این قدر دل کیست نداند
شاپور بہ محشر چہ حساب است وکتاب است　　باہیچمدانی کہ دہ از بیست نداند

(مؤلف) مرزا سودا کا اعتراض لغو تو نہیں ہے مگر تاہم نہایت کمزور ہے۔ غرض مرزا فاخر مکین کی یہ ہے کہ اگرچہ اُس کی زبان میں لکنت ضرور ہے مگر اس لکنت پر بھی جو بات کہتا ہے وہ صحیح کہتا ہے۔ وہ بات جو کہتا ہے اس سے دل ٹوٹتا ہے اگرچہ بذات خود اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ کسی کا دل ٹوٹے۔ مگر اس کے الفاظ میں خاصیت ہی یہ ہے

مرزا فاخر مکین ؎ تقصیر چیست مشت مزن پنجہ ام مپیچ　　قرباں شوم بزور از ایں ناتواں مرنج

اعتراض مرزا سودا۔ مشت زنی اور پنجہ پھیرنا پہلوانوں کا کام ہے۔ معشوق کا کام غمزہ وناز وادا کا ہے بلکہ عاشق کا دل زیادہ

فریفتہ ہو - اوس عاشق کی حالت پر افسوس آتا ہے جو ناتوان ہو - اگرچہ شعراء نے پنجہ مروڑنا اور مشت زنی معشوق کے لئے باندھا ہے - مگر اس صورت سے جیسا کہ مرزا صائب کہتے ہیں ؎

دست پیچیدن و دل بردن و پنہاں گشتن　　　　ہر چہ میگوئی ازاں موئے میاں مے آید

(مؤلف) غالباً مرزا سودا کو اعتراض کرنے کے بعد یاد آیا ہے کہ پنجہ مروڑنا اور مشت زن ہونا شعراء، صفاتِ معشوق میں لاتے ہیں مگر پھر بھی مشت زن ہونا اس سے ثابت نہیں ہوا - اور یہاں موئے کمر کے پنجہ مروڑنے کا ذکر ہے جو موزوں ہے - میں سعدی کا ایک شعر سناتا ہوں جس میں انھوں نے مشت زن کو صفاتِ نازنین سے قرار دیا ہے

غلام آب کش باید و خشت زن　　　　بود بندۂ نازنین مشت زن

مرزا فاخر مکین ؎ شہادت از کف او بہتر است بسم اللہ　　　　کند شروع بچیزے کہ بہتری داند

اعتراض سودا - دوسرے مصرع میں لفظ شروع بہت برا ہے لفظ شروع اس کام کیلئے لکھتے ہیں جو طویل ہو جائے - یہاں پر محض حشو اور زائد ہے اور وہ بھی نہایت بے ربط ہے - شہادت ایسا کام ہے کہ ایک تلوار کی ضرب سے پورا ہوتا ہے اوس میں نہ صف کشی کی ضرورت ہے اور نہ اس کی کہ معشوق روزانہ ایک ضرب لگاتا رہے - آج خنجر سے حملہ کیا اور کل تیر سے حملہ کیا - اور اس طرح حملہ کرتا رہا - اگر شہادت اسی طریقہ سے ہوتی ہو تو خیر کوئی مضائقہ نہیں ہے

(مؤلف) مرزا سودا کا یہ اعتراض بھی کوئی وزن نہیں رکھتا - اس واسطے کہ ان کا بڑا ایراد یہ ہے کہ شروع وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں وقفہ ہو - میں کہتا ہوں کہ وقفہ میں یہ ضرورت نہیں ہے کہ وہ زیادہ ہو جب قتل کے لئے تلوار اٹھائی وہی شروع ہے اور جب قتل ہو چکا وہ ختم ہے - اس میں طولِ مدت کی کیا ضرورت ہے - ہمیشہ کہا جاتا ہے کہ پھر اب اس کام میں دیر کیا ہے شروع کیجئے - ایسے بہت سے شعر اساتذہ کے یہاں ہیں اُردو کا ایک شعر مجھے بھی یاد ہے　　　　امیر ؎

شروع عشق ہے اور ابتدائے آہ ہوتی ہے　　　　مبارک طفلِ دل کی آج بسم اللہ ہوتی ہے

مرزا فاخر مکین ؎ بلبل ز رشک سوخت کہ از شور نالہ ام　　　　ہر ریشۂ خار بر سر دیوار روشن است

چوں مجمر و سپند ز شور صفیر من　　　　صیاد غافل و قفس و دانہ روشن است

اعتراض مرزا سودا - ان دونوں شعروں میں لفظ روشن آیا ہے اور سوختن کے معنے نکلتے ہیں - ہم نے سوائے شمع اور آتش اور چراغ کے روشن کا اطلاق دوسرے پر نہیں دیکھا - اس کی سند کی ضرورت ہے اگر شمع کی تشبیہ کے ساتھ لایا جاتا تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا

(مؤلف) مرزا سودا کے اس اعتراض سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ فارسی میں روشن، شمع اور آتش اور چراغ کے سوائے دوسرے

لفظوں کے ساتھ جلانے کے معنے میں نہیں آتا۔ مگر اس کا کیا علاج ہے کہ مکینؔ کے شعروں کے یہ معنے ہی نہیں جو وہ سمجھے۔ پہلے شعر کے معنے یہ ہیں۔ کہ بلبل اس رشک سے جل رہی ہے کہ میری آہ سے ہر کانٹا روشن ہوگیا ہے۔ روشن کے معنے یہاں یہ ہیں کہ ضیا دینے لگا اور اس کے رشک کی وجہ یہ ہے کہ وہ عمر بھر نالہ و فریاد کرنے کے باوجود کبھی ایک خار کو بھی نہ جلا سکی۔ دوسرے شعر کے یہ معنے ہیں کہ صیاد کو خبر بھی نہیں ہے اور حالت یہ ہے کہ میری آہ سے مجمر اسپند کی طرح دانہ اور قفس روشن ہو رہے ہیں۔ یہاں بھی روشنی کے معنی محض جلنے کے نہیں ہیں۔ اور یوں تو لفظ روشن ہمیشہ سوختن کے مفہوم کو اپنے ساتھ لئے ہی رہتا ہے

مرزا فاخر مکین ؎ نیارد تاب شوخ من ہجوم عشقبازاں را شہے از کثرت خیل و حشم رنجیدہ را ماند

اعتراض مرزا سودا۔ سلطنت کا کام خیل و حشم کی فراوانی سے درست ہوتا ہے۔ اور بادشاہ سپاہیوں کے جمع ہونے پر ناز کرتے ہیں نہ کہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ یہ تمثیل درست نہیں ہے

(مؤلف) مرزا فاخر مکین کا مقصد یہ ہے کہ جیسے کوئی بادشاہ نوکروں چاکروں کی کثرت سے گھبرا جاتا ہے بالکل اسی طرح وہ بھی ہجوم عشاق سے گھبرا گئے ہیں۔ سودا کا اعتراض جس خیال کو دامن میں لئے ہوئے ہے اوس لحاظ سے درست ہے

مرزا فاخر مکین ؎ در خیال باغ خلد و شاخ طوبیٰ شیخ خفت کوئے او را با قد دلجوئے او در خواب دید

اعتراض مرزا سودا۔ جو چیز کہ آدمی کی ہم جنس ہو یا اُس کی ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہو اوس کو خواب میں دیکھ سکتے ہیں یعنی جیسے کہ کوئی کہے کہ فلاں کو پر تکلف لباس پہنے دیکھا۔ یا زید کو عمر کے ساتھ خواب میں دیکھا تو یہ درست ہے۔ لیکن گلی یا دروازے کو قد کے ساتھ کیا مناسبت ہے گلی کو قد کے ساتھ دیکھنا نیا مضمون ہے

(مؤلف) اعتراض دُرست ہے اگرچہ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کو اس کی گلی میں دیکھا

میر و سودا

دلی کی آبادی اور سرسبزی کے زمانے میں جب فرد فرد مئے عشرت سے مست اور بادۂ سرور سے ساغر بدست تھا۔ یہ دونوں استاد فن دہلی ہی میں مقیم تھے۔ سودا تو دلی کے رہنے والے ہی تھے ان کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ رہے میر صاحب۔ انھوں نے بھی اپنے مولد و مسکن کو دلی کی بود و باش کے خاطر تج دیا تھا۔ یہیں آ رہے تھے۔ اور یہ رہنا وہ رہنا تھا جس نے وطن اور وطن کی یاد۔ اعزہ و اقربا احبا سبھی کو دیسے بھلا دیا تھا۔ میر صاحب کی شاعری کو جو کچھ عروج ہوا جتنا عروج ہوا دلی ہی کے گلی کوچوں میں ہوا۔ اور یہیں وہ مشہور ہوئے یہیں ان کا کلام مشہور ہوا۔ محفلیں۔ مجلسیں۔ جلسے۔ مجمعے ان کے کلام سے مستفیض ہوئے۔ امرا و رؤسا۔ ارباب ذکا اہل ذوق نے ان کی قدر کی۔ وہی دن۔ وہی زمانہ وہی عالم۔ وہی وقت اور وہی موسم مرزا کی شہرت کا تھا۔ ان کی شعر گوئی

سے بھی محفلیں گونج اٹھی تھیں ارباب ادب مست ہو گئے تھے۔ اہل دل کے کان ان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ارباب دول اہل ہمت انھیں اپنے یہاں بُلاتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ زمانہ کا دستور ہے کہ جب دو کامل فن کہیں ہوتے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے سے بڑھے چڑھے سمجھے جاتے ہیں تو ان میں موازنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جاننے والے تو جاننے والے ناآشنائے فن تک میزان تقابل ہاتھ میں عقل و ہوش کے پلوں میں دونوں کے کمالوں کو تولتے رہتے ہیں۔ جانچتے ہیں۔ بانچتے ہیں۔ ہنستے ہیں قہقہے لگاتے ہیں۔ کبھی اس کو اُس سے بڑھاتے ہیں اور کبھی اوس کو اس سے آگے پہونچاتے ہیں۔ یہی ہوتا رہتا ہے۔ یہ دونوں سنتے رہتے ہیں، پہلے کچھ دنوں اونھ کہکر ہنستے ہیں۔ ٹالتے ہیں۔ اور ہوتے ہوتے آخر کار اپنے کمال پر خودی اور خود بینی کی نگاہ ڈالتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ دن آجاتا ہے کہ ایک دوسرے کو اپنا حریف اور مدمقابل ٹھیراتا ہے۔ یہی سودا اور میر میں بھی ہوا۔ اول اول میں دونوں دوست تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ جیسے میر سودا کو پورا شاعر مانتے تھے ایسے ہی سودا بھی میر کو یکتائے فن جانتے تھے۔ مگر بھڑکانے والوں نے دونوں کو بھڑکا دیا۔ منھ دیکھے کی باتیں تو خیر آداب شرافت میں داخل تھیں وہ کہاں جاتیں۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کی طرز و روش پر ایک نگاہ گرم ایسی ڈالی کہ خوبیاں تو دھواں بنکر اُڑ گئیں۔ خامیاں اور بُرائیاں رہ گئیں جو نظر آنے لگیں۔ دبی دبی زبان سے ایک نے دوسرے کو کہا جو کچھ کہا۔ اور اجٹتا اجٹتا ایک نے دوسرے کی بابت سنا جو کچھ سنا۔ سودا کی رائے مسلم ہم تک نہیں پہونچی مگر ضمیر متکلم کی طرح اسی اعتراض میں آپ اُس کو پائیں گے اور اُس سے حظ اٹھائیں گے۔ مگر میر کی سودا کی بابت جو رائے تھی وہ سودا ہی کی زبانی ہم تک پہونچی ہے جو بجنسہ آپ کو سناتے ہیں۔ سودا میر صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں اور اسی کے ذریعہ سے اپنی بابت میر کے خیال و رائے کا اظہار کرتے ہیں سنئے

میر صاحب مرے کرم فرما — مبدع عقل وکان و فہم و ذکا
عرض رکھتا ہوں اے کرم گستر — اعتراضی سے پر مجھے ہے ڈر
کھول سکتا نہیں میں اپنے لب — اس سبب سے کہ ہے یہ جائے ادب
جو سخن آپ کی زباں سے سنا — کچھ نہ بولا سوائے امنّا
لیکن اب آپ سے کئی اک عرض — کرنی مجکو ہوئی ہیں واجب فرض
آپ کے ہوتے جب کسی کے حضور — مرثیہ کہنے کا ہوا مذکور
واں یہ بولی زبان سحر طراز — حق میں اس بے نوا کے بندہ نواز
ریختے کی وہ جو کہے ہے غزل — لفظ و معنی میں اس کے کم ہے خلل
مرثیوں کے سنے جو کتنے بند — بندش اون کی نہ آوے اپنی پسند
معنی اون کے تب آئیں فہم کے ہاتھ — شرح لکھدے جو مرثیے کے ساتھ

سودا کے اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ میر صاحب سودا کے مرثیے کی نسبت کوئی اچھی رائے نہ رکھتے تھے اور غزل گوئی

میں ان کو مسلم جانتے تھے۔ اسی پر سودا برہم ہوئے پہلے کچھ دبے دبے الفاظ لکھے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کے سلام اور مرثیے پر اعتراض بھی کر دئے۔ پہلے اعتراض کرنے کے عنوان دیکھئے اور پھر اعتراض دیکھئے کہتے ہیں کہ ؎

جب یہ تکرار میں سنے یہ سخن   دل میں گزرا کہ مرثیے کا فن
ہوئیگا فن شعر سے باہر   میر کی گفتگو ہے دال اس پر
اس کا آگاہ جو کوئی ہو خوب   سیکھئے اس سے کہنے کا اسلوب
ماہر اس فن کے جب کئے میں غور   دل میں تم سا کوئی نہ ٹھہرا اور
آپ کے مرثیوں کو تب اکثر   ڈھونڈھنے میں لگا ہر اک کے گھر
ہاتھ آیا مرے بہ سعئ تمام   غرض اک مرثیہ اور ایک سلام
فہم میرا جب اُن میں در آیا   واہم اپنا بہت بجا پایا
مرثیہ کہنے کا ہے جو آئیں   واقعی فن شاعری میں نہیں
بلکہ وہ چیز جس سے شعر ہو رد   مرثیے میں روا رکھے ہے یہ کد
مطلب اس کام کی جُدی ہے راہ   شاعر اس راہ سے نہیں آگاہ
ضد کے مارے تو یوں وہ کچھ ہی کہے   چاہے ایسا کہے تو کہہ نہ سکے
شعر کے قاعدے کی موجب ہم   کہنے لاگے تھے مرثیہ کم کم
سوز بانی تمھاری اے مخدوم   ہوا اپنے تئیں کو یوں معلوم
مرثیہ وہ جسے عوام الناس   روئیں سُن سُن پڑا ہیں جب انکے پاس
اور سودا کا مرثیہ سُن کر   چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھن کر
کیسی ہی طرح کوئی اس کو بنائے   لیکن اس پر کبھو نہ رو تا آئے
بارہا یہ سخن ہوا ظاہر   حق میں بندے کے غائب و حاضر
سچ ہے یہ مجکو مرثیے کا ڈھب   نہیں آتا وہ جس سے رو دیں سب
آپ کے مرثیہ کا ہوں قائل   خون جس سے عوام کا ہے دل
سنئے مُجا سے جس پہ بُدھو تک   شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس   یہی آتا ہے بار بار افسوس
بُدھو جما سمجھ جسے رو دیں   معنے اُس کے نہ مجھ سے حل ہو ویں
جب یہ صورت خیال کرتا ہوں   اسی غیرت کے مارے مرتا ہوں

غرض اس امر میں کہوں اک بات — مانوں تو جانیں گے ہے اپنی نجات
وہ جو اک مرثیہ اور ایک سلام — دستخط خاص سے رکھے ہے غلام
مَن بکّا کے حدیث پر کہیے — عمل اور معنے اُس کے رکھ لیجے
میں بھی آگاہ اس سے تا ہوؤں — جھوٹی امت میں بیٹھ کر رو دوں
شعر میر — اعتراض سودا۔
ای نبی کے باطناً رتبے کے والی السلام — ظاہرا اُن سے بھی ہوا اک نوع عالی السلام
پہلے یہ کہیے اسے کرم فرما — باطنی رتبہ ہے نبی کا کیا
آپ پر جس طرح سے ہو تحقیق — اپنے مخلص سے بھی کہو تحقیق
دوسری بات یہ جو کہہ ڈالی — ہو تم اک نوع ان سے بھی عالی
اور اُس نوع کو بیاں کیجے — مجھ کو آگاہ اس سے کر دیجے
یا وہ جس طرح تجھ پہ ہے اثبات — کہو تو عرض میں کروں وہ بات
گرچہ وہ شخص ہے امام حسین — ایک دن جس کو سید الثقلین
لگے فرمانے مجھ کو بتلا تو — مرتبہ میں بڑا ہوں میں یا تو
تب یہ بھائی پہ لوٹ کر بولا — کیوں یہ سررشتہ بات کا کھولا
عرض کرتا ہوں مجھ کو کیجے معاف — دل میں کر لیجیو سنکے یہ انصاف
ماں مری فاطمہ علی ہے باپ — والدین اپنے اب بتا دیں آپ
اور جس شخص کا نواسا ہوں — امر ہو تو اُسے بھی بتلا دوں
حق میں جس کے ہے آیۂ لولاک — ہے زبانی خالق افلاک
سب نبی جان اس کو مانیں ہیں — اپنے نانا کو آپ جانیں ہیں
یہ لطیفہ ہوئے خوش آں سرور — نور چشم اپنے سے عرض سُن کر
متبسم ہو تب یہ فرمایا — سخن راست حق کو بھی بھایا
اُن کے رتبے کے ہے بہم یہ نمط — لیک جو آپ سمجھے ہیں سو غلط
ظاہرا تم کو ہے یہ قصہ یاد — جس کے رووے کی فہم کو برباد
رتبۂ باطنی پیغمبر — اپنے نزدیک ایک ٹھیرا کر
نسبتی مرثیہ کو تم فائق — اس پہ سمجھے ہو یہ نہ تھا لایق
باطنی رتبہ جو نبی کا ہے — اُس کے مافوق ہے سو بیجا ہے

موجب اس رتبہ کے نبیؐ کریم　　آپ کو بولے احمدِ بے میم
میم احمد سے کر دیا جب رد　　تھا جو احمد سو ہو گیا وہ احد
احدیت سے ہے مرتبہ بالا　　سمجھے گا تب ہی پوچھنے والا
فہم یوں، باطنی سے ماہر ہے　　اُس سوا رتبہ جو ہے ظاہر ہے
کس طرح سے کہو تو سبط نبی　　رتبۂ باطنی سے ہو عالی
حرف میرا نہیں ہے لایعنی　　فہم کے معترض ہیں یہ معنی
غش نہیں صرف اس کے مضموں میں　　خلل اس سے زیادہ موزوں میں
کہو تقطیع شعر کو کر دوں　　بندش الفاظ کی ہے ناموزوں
مصرع ثانی سے بھی ہو آگہ　　نوع کے عین کو نہیں جاگہ

(مولف) سودا نے جو اعتراض مذہبی کیا ہے وہ تو عقاید کے متعلق ہے۔ اور اس کا باز پرس کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جس کی شان میں یہ سب کچھ کہا ہے۔ یا پھر اس سے بھی آگے بڑھیئے تو احکم الحاکمین کے دربار کے فیصلہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک جو اجلاس قیامت ہی میں منعقد ہو گا۔ وہاں جو کچھ بھی ہو۔ سودا حق بجانب رہیں یا میر اب رہا عین کے گرنے کا معاملہ وہ میر صاحب کی عین الکمال کے لیے چشم زخم سے کم نہیں۔ اور سودا کا اعتراض کرسی نشین ہے۔ رہی بندش شروہ یقینی میر کے مرتبہ سے بہت پست اور بہت گری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

میر سے اعتراض۔

اے تصدق یہ پدر یہ مادر اور یہ جدِ پاک　　ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السلام
گر نہیں جانتے تو سن لو اب　　ساتھ اس کے ہے جس کا نام نسب
گر تعلق کمال کا ہوتا　　پسر نوح باپ سا ہوتا
منحصر کچھ نہیں نسب پہ کمال　　جس پہ ہو فضل ایزدِ متعال
بندش الفاظ کی غلط اس کی　　بُری ہے معنی کی نمط اس کی
پیش مصرع میں لفظ یہ سے مراد　　آپ کو ہے بزرگیٔ اجداد
پر نکلتا ہے اس سے یوں بے کد　　سب تصدق پدر سے لے تا جد

(مولف) اس میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ میر صاحب کے شعر کی بندش نہایت سست ہے

میر سے　　لامکاں بھی ایک بازی گاہِ طفلی ہے ترا　　کوئی مکاں تم سے نہیں پایا میں خالی السلام

اعتراض سودا ؎ عوض کوئی مکاں جو لفظ فصیح — بولے کوئی جا تو تھا یہ صحیح

(مؤلف) اعتراض و اصلاح دونوں درست تر ہیں

میر تقی ؎ ہے گریباں گیر گردوں تیرے لشکر کا لہو — تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السّلام

اعتراض سودا۔ خوں سوا ایسی جا میں لفظ لہو — نہیں آیا محاورے میں کبھو

اور لالی کا حرف کر دو حک — ہو نہ ثابت شفق سے یہ جب تک

تا نہ تشبیہ ہو شفق کی یہاں — معنی جو جا ہو اس میں تم سو کہاں

(مؤلف) دونوں اعتراضات مہمل ہیں۔ ایسی جگہ جو لفظ لہو نہ آنے کی شرط لگائی ہے اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ لالی کے ساتھ شفق کی شرط لازمی لگانا بھی تناسب الفاظ کی جگہ بندے سے آگے نہیں بڑھتا

میر تقی ۔ اے ہو الاول ہو الآخر کے مالک بالیقین — ہے ہو الظاہر ہو الباطن کے والی السّلام

اعتراض سودا کیا ہو الاول و ہو الآخر — کیا ہو الباطن و ہو الظاہر

حق کی جانب پھری ہے انکی ضمیر — اس سوا جس پہ کہیے ہے تکفیر

کیا یہ خاطر میں آپ کی آیا — ملک اس کا حسین ٹھیرایا

(مؤلف) یہ اعتراض بھی شرعی نقطۂ نظر سے ہے اور جو فتوے دیا گیا ہے درست ہے

میر تقی ؎ یہ شہادت تیری تائید انا بشر کی تھی — کیا حدیث شکلم تم نے نبھائی السّلام

یہ شہادت تیری کلمے کی شہادت ہو تمام — عبد ہو کے بات تم نے ساری پائی السّلام

ورنہ تم بے شبہ و بیشک احمد بے میم ہو — لی مع اللہ کے ہو تم ہر وقت حالی السّلام

اعتراض سودا۔ کرتے ہو تم خطاب یوں بہ امام — ہے تمہارا یہ مدعائے کلام

ہے نبی و امام حق کی ذات — حق کو کیا کام از حیات و ممات

انا بشر جو بولے پیغمبر — اس کے اثبات پر دیا تیں سر

رتبہ تیرا ہے جوں خدا عالی — عبد تیں ہو کے بات سب پالی

تو بلاشک ہے احمد بے میم — لی مع اللہ میں ہر زماں ہے مقیم

ہے تصوف کی راہ سب یہ درست — بندش الفاظ کی پر اتنی سست

نہیں لفظوں سے معنی کو کچھ ربط — سمجھے وہ ہی جسے ہو کچھ سا خبط
اور ہے راہ جو شریعت کی — وہاں خدا ہے خدا نبی ہے نبی
انا بشر ہے آیۂ قرآں — وحی ہے پیمبر دو جہاں
مثلکم جزو ہے اس آیت کا — منفصل باندھنا نہیں سمجھا
کس کے اس کا بیاں ہو شان نزول — جس طرح چاہیئے سوائے رسول
میں کہتے ہیں سلام تو اکثر — لفظ و معنی میں بہتر از بہتر
لطف ہے اس سلام میں اک اور — کہ نہیں اس میں السّلام کو غور
بس جو بے ربط اسقدر ہو سلام — بھیجے تم سا اُسے بہ نذرِ امام

(مؤلف) اعتراض درست ہے - دو شعروں میں ایک آیت کے ٹکڑے کرکے باندھنا کسی صورت میں صحیح نہیں معلوم ہوتا

اعتراضات بر مرثیہ میر تقی از سودا

قبل اس کے کہ اعتراضات قلم بند کئے جائیں بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کا مرثیہ اور اعتراضات کے متعلق جو کچھ خیال ہے وہ لکھ دیا جائے - تاکہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کون کون سی چیز مرثیہ میں اون کی نظر میں کھٹکتی ہے - وہ کہتے ہیں

" اگر حق تعالے نے صبح کا غذ سپید کے مانند شام سیہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے - تو ہر انسان کے دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے - چاہیئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے - ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کا ہے کو مرے - ہر چند کلام استادان سلف پر بھی غلطی کا گمان ہے - کس واسطے انسان مرکب من الخطاء والنسیان ہے - لیکن خدائے تعالے نے جنھیں شعور کرامت کیا وہ سمجھتے ہیں - ناگاہ اگر لکھ بتی کے بدرہ سے زر قلب نکل آوے تو اس پر کسی کو غور و خوض نہیں اور جو خریطۂ صراف سے ایسا کچھ پائے تو اُسے کہیں ٹھور نہیں - پس لازم ہے ذی ہوش کو ربط الفاظ سے معنی کو سمجھ کر دے - تا وبال فیضان ناطقہ اپنی گردن پر نہ لے چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں -

اوّل اندیشہ وانگہے گفتار — پائے بیش آمدست پس دیوار

انسان جس فن سے آپ کو کما ینبغی ماہر نہ کرے - چاہیئے کہ اوس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے - گفتگوئے جاہل بیہودہ عالم مور دانفعال بلکہ خموشی ہے - اوس کی برابر صد فضل و کمال ؎

بات آوے نہ تو چپ رہ کہ گماں کے نزدیک — سو طرح کا ہے سخن پردۂ خاموشی میں

اگر نگاہ جس فن کا آگاہ ہے اوس فن کی بولی بولے - گویا ہر دو لب اس کے دروازہ رسوائی کے پاٹ ہیں کہ خود آپنے

منہ پر کھولے ؎

طُرفہ میوہ ہے یہ سخن اے دوست　　مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصۂ چالیس برس کا بسر ہوا ہے۔ کہ گوہر سخن عاصی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے اس مدت میں مشکل کوئی دقیقہ سخن سنجی کا تمام رہا ہے۔ اور سدا مرغ معنیٔ عرش آشیاں گرفتار دام رہا ہے۔ باوصف اس کے قول خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیا ہے۔ بلکہ تمام عالم کے سخن انصاف پر تلمیذانہ گوش دیا ہے۔ جس کی زبان پر انصاف قبیل اعدات سے حرف واقعی اور منصفانہ جاری ہوا ہے۔ باللہ کہ مرتبہ من تعلم حرفاً فہو مولاہ طاری ہوا ہے۔ اور بے اختیار زبان سے یہ مصرع سرزد ہوا ؎

وائے بر جان سخن گر بہ سخنداں نرسد

لیکن مشکل ترین دقایق طریقہ مرثیہ کا معلوم کیا۔ کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا۔ چنانچہ اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا ہے۔ اُسی مرحوم مغفور نے یہ فرمایا ہے ؎

جمعے کہ پاس محمل شاں داشت جبرئیل　　گشتند بے عماری و محمل شتر سوار

پس چاہیئے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہے کہ عقلا جو نہ سمجھیں اور ضبط تضحیک و قصد بُکا میں رہیں اوس کا سیاق و سباق جہلا دریافت کریں اور پھوٹ بہیں ؎

معنی لفظوں سے ہوتے ہیں رُو پوش　　یہاں تلک رتبۂ سخن پہونچا

اس قدر لکھنے کے بعد سودا نے میر صاحب کے مرثیہ پر اعتراضات شروع کئے ہیں۔ جن میں سے سب تو نہیں مگر چیدہ چیدہ چند اعتراضات یہاں لکھے ہیں

میر تقی ؎

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہی　　مصیبت ہے ماتم ہے غم ہی تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے　　حسین علی کی شہادت کی شب ہے

اعتراض سودا ؎

یہ مطلع جو ہی آپ کا تو عجب ہے　　کہ یہ ریختے کہنے والوں کا ڈھب ہے
وے فیض کا ناطقے کے سبب ہے　　نہ جانو کہ یہ مرثیہ یونہیں سب ہے

(مؤلف) اعتراض کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی

میر تقی ؎

محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے　　ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے　　کہ روز قیامت کی گویا یہ شب ہے

اعتراض سودا ؎

تجی کا رچی قافیہ شائیگاں ہے　　سو وہ ہر سہ مصرع میں صورت کہاں ہے
رچی اور مچی قافیہ جبکہ یہاں ہے　　تو یہ قافیہ ہر طرح سے کہ ڈھب ہے

(مؤلف) سودا نے اس قافیہ پر پہلے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ شائیگاں ہے۔ تجی اور رچی میں بے شک شائیگاں کا عیب موجود ہے دوسرا اعتراض یہ ہے کہ رچی اور مچی قافیہ کہنے کے بعد یا پہلے تجی کا قافیہ نادرست ہے۔ یہ اعتراض بھی غلط نہیں ہے۔ اس قسم کے قافیے لانا قافیہ کا ایک بہت بڑا عیب ہے۔ اس کو اکفار کے عیب سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ اکفار عیوب قافیہ میں سے ایک عیب کا نام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حرف روی مختلف ہو یعنی مطلع کے دونوں مصرعوں یا رباعی کے تینوں مصرعوں میں دو حرف یا تین حروف روی مختلف آئیں اور یہ حروف مختلف ایسے ہوں جن میں باہم قافیہ ہونے کی صلاحیت موجود ہو۔ مثلاً رباعی کے ایک مصرع میں حروف روی (ز) ہو دوسرے میں ذال۔ تیسرے میں (ظ) اگلے لوگوں نے اس کو بہت زیادہ معیوب بنایا ہے۔ اور اسی قبیل سے حروف عربی و فارسی و ہندی کا جمع کرنا عیب سمجھا ہے۔ مثلاً تپ اور کپ۔ ناج اور تاج۔ آخرالذکر کو میں بھی مذموم جانتا ہوں۔ مگر اول الذکر یعنی ض۔ اور ذال کو ہم قافیہ کرنا اس زمانہ میں میرے نزدیک اس وجہ سے عیب نہیں ہے کہ ایسے حروف کا ہم قافیہ کرنا اس لئے عیب ہے کہ عرب کے لہجہ میں ان سب کے مخارج جدا جدا ہیں۔ اور وہ سب کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سننے والا دونوں حروف کی علیحدگی کی تمیز کر لیتا ہے۔ اور اسی کی تقلید اہل فارس نے کی ہے۔ پھر اہل فارس کا اتباع تو گویا اردو کے بانیان شعر کا ایک ضروری اور لابدی فرض تھا وہ بھلا کیوں اس کو جائز رکھتے۔ فارس والوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی آنکھ بند کر کے یہ فتوے دیدیا کہ ایسے حروف کا جمع کرنا حرام قطعی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان کے لہجے میں نہ تو قاریوں کو شعر پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ض۔ ظ۔ ذ۔ ز۔ س۔ ث۔ ص۔ وغیرہ کے لہجے علیحدہ رہ گئے ہیں یکساں مخارج ہیں۔ یکساں طرز ادا ہے یکساں تلفظ ہے پھر اس قید و بند سے آزاد خیالات کی گردن جکڑنا کیا معنی رکھتا ہے

اب لیجئے حروف ہندی کے اختلاف کا جھگڑا وہ بہت برا ہے۔ رچی اور تجی کا قافیہ صحیح نہیں مگر غور کرنے اور دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اردو شعر گوئی کے ابتدائی دور کی ناواقفیت یا عدم پابندی نے جہاں شعراء کے لئے اور آزادیاں دے رکھی تھیں۔ وہاں ایک یہ بھی تھی۔ ان کو زیادہ تر ادائے خیال اور حسن بندش۔ گداز جذبات سے کام تھا۔ اس کے علاوہ وہ کسی بات کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ لفظوں میں انھوں نے اصلاحیں دیں۔ مخفف کو مشدد۔ مشدد کو مخفف انھوں نے باندھا۔ ساکن کو متحرک۔ متحرک کو ساکن انہوں نے کیا۔ محاوروں میں تصرفات سے انہوں نے کام لیا۔ تذکیر کو تانیث اور تانیث کو تذکیر کے جامے میں وہ لائے جہاں یہ سب ہوا وہاں ایک یہ معمولی سی بات بھی ہوگئی۔ سودا کا اعتراض درست اور بجا۔ مگر وہ میر صاحب کے معاصرین میں سے کس کس کو روکیں گے۔ اور اس غلطی پر کسے کسے ٹوکیں گے میں اس کی مثالیں کچھ خود تلاش کر کے لکھتا ہوں۔ کچھ جابجا سے نقل کئے دیتا ہوں۔ یہ عیب ہے تو یوں سمجھئے کہ آپ عیبوں کے ایک جنگل میں گھوم رہے ہیں۔ اور سب کی اس سہل انگاری کو دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کے ایک معاصر میر حسن کو لیجئے وہ کہتے ہیں۔

میر حسن (۱) لئے بیلچے ہاتھ میں مالنیں ‌ ‌ چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں

" (۲) لگا پھرنے وہ سرو جب پاؤں پاؤں ‌ ‌ گئے بھاگ آزاد جب اس کے ناؤں

عشرت (۳) سوانگی رائے پردہ رائے چتوڑ — غرض اب مستعد بیٹھا ہے ہر طور
یار محمد خاں شوکت (۴) عنان سمندِ صبا دم پکڑ — جو کاوے پہ ڈالا کمر راست کر

ایسے شعر ڈھونڈھیں تو بہت سے ملیں گے۔ مگر کیا فائدہ۔ انھوں کو دیکھئے اور سوچئے کہ غریب سودا کس کس پر اعتراض کرتے اوروں کو جانے دیجئے، وہ خود کو بھی اس عیب سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ اور ایک جگہ چھوڑ دو دو جگہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہتے ہیں

سودا ؎ ستوں اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار — رہے دو دانت آگے سو ہیں اڑواڑ
؎ الغرض اس طرح سے کشتی لڑ — ڈال ہنکلے کا پاؤں پر

اگر میر صاحب ہی سودا سے پوچھ بیٹھتے کہ کیوں میاں۔ یہ چار کا قافیہ اڑواڑ۔ اور لڑ کا قافیہ پر۔ کیا ہے تو میں جانتا ہوں سودا جواب دینے کے بجائے یہ کہکر گردن جھکا لیتے کہ حضرت خطا ہوئی۔ یا بہت ہٹ دھرمی پر آتے تو کہدیتے کہ سب کہتے ہیں ہم نے کہا تو کیا بگڑا

اس سے بھی زیادہ لطیفہ سنئے مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی کا یہ شعر جہاں نقل کیا ہے ؎

کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانے — ہم ہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

وہاں لکھا ہے ردیف وقافیہ میں عروضیوں کی بیجا قیدوں کی چنداں پابندی نہیں کی مگر جو اصل مقصود ردیف قافیہ سے ہوتا ہے اوس کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً شعر مذکورۂ بالا۔ اس ردیف کو ہمارے شعراء ضرور غلط بتائیں گے مگر ردیف کا جو اصل مقصد ہے وہ اس سے بخوبی حاصل ہوتا ہے کیونکہ سامع کو یہ شعر سُنکر واحد اور جمع کا فرق مطلق محسوس نہیں ہوتا اور یہی ردیف کا حاصل ہے

میر تقی ؎ کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہوئے گا — قیامت میں یہ کچھ نہوئیگا جواب ہے
اعتراض سودا ؎ جو تقطیع سے شعر کی تم ہو ماہر — تو افزودئی ہمزہ دیا ہے ظاہر
مگر صاحب اس بحر کے رکن آخر — نہوگا ہے موزوں نہوئیگا وہ کب ہے

(مؤلف) میر صاحب کے یہاں نہوئے گا ہے۔ اور سودا کہتے ہیں کہ نہوگا ہونا چاہیئے۔ اس میں میر صاحب کی غلطی کا خیال نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس وقت کی رسم کتابت ہی ایسی تھی۔ سے۔ کی بجائے۔ سیں۔ اور۔ کو۔ کی بجائے۔ کون۔ سبھی لکھتے تھے۔ رہا تقطیع کا معاملہ تقطیع میں جب نہوئے گا کی بجائے نہوگا بھی موزوں ہے۔ تو پھر شکایت بیکار۔ اور اعتراض لاحاصل ہے

میر تقی ؎

ہے چاروں طرف ہو رہا شورِ محشر زمیں آسماں ہو رہا ہے تل اوپر
حُسینِ علی پر چلایا ہے خنجر ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

اعتراض سودا ؎

کہو پہلے مصرع کو یوں مجھ سے سنکر زمانے میں ہر سمت ہے شورِ محشر
یہ تقطیع ناموزوں اے بندہ پرور زباں پر فصیحوں کو لانا غضب ہے

(مؤلف) معلوم نہیں سودا نے یہاں تقطیع کی ناموزونی کا اعتراض کس بنا پر کیا ہے۔ یہاں تعقید کا اعتراض البتہ ہو سکتا تھا۔ جو سودا کی اصلاح سے دُور ہو گیا۔ اور لطف یہ ہے کہ اعتراض کی قابل باتوں پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ مثلاً حُسین علی جو بجائے حسین ابن علی کے لایا گیا ہے۔ یہ ترکیب اُردو کے لحاظ سے مُستند اور وقیع نہیں ہے اگرچہ عربی میں درست ہو ایسے ہی۔ تل اوپر۔ بجائے تلے اوپر کے غلط ہے اور اس کو اگر صحیح پڑھیں تو شعر ناموزوں ہوا جاتا ہے

میر تقی ؎

بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہ تشنہ لب کا کسے غم سنائے یہ کس مُنہ سے کہئے کہ وہ خشک لب ہے

اعتراض سودا۔

کسے کہتے ہو کون ہے وہ کہاں ہے کہیں ہر سہ مصرع میں اس کا نشاں ہے
جو اپنے یہ اس گفتگو کا گماں ہے تو یوں کہئے کہنے کا اسکے یہ ڈھب ہے
بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہاؤں یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈباؤں
شہ تشنہ لب کا کسے غم سناؤں یہ کس مُنہ سے بولوں کہ وہ خشک لب ہے

(مؤلف) سودا کا یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ اور جب اعتراض درست نہیں تو پھر اصلاح کیوں درست ہو گی۔ اسواسطے کہ میر صاحب نے اس بند کو پہلے بند سے متعلق رکھا ہے۔ کہ اوس میں وہ کہہ چکے ہیں "ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے" اور وہ یہ سب کچھ جان ہی کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ کہ جان کے لئے یہ زیبا ہے اور یہ زیبا ہے وغیرہ

میر تقی ؎

لعینوں نے اسکو وطن سے بُلایا بمعہ اقربا لا کے بن میں بسایا
پھر اُس جور سے اس کو مارا ہی پیاسا کہ جس غم سے خورشید کے تئیں تب ہے

اعتراض سودا۔

بمعہ اقربا نے زافزونیٔ با کیا غیر موزوں یہ مصرع سراپا
نہیں اس میں ہرگز مرا حرف بیجا کہ اوزان اشعار میرے بلب ہے

(مؤلف) سودا کا اعتراض بالکل صحیح ہے۔ میر صاحب سے تعجب ہے کہ انہوں نے کیونکر جاہلوں کے لفظ سے کام لیا۔ بمعہ۔ سراسر جہلا کی گفتگو ہے

غرض وہ جفا اُس کو دکھلائی ظالم — کہ جس کا ہی آپ رب ہے گا عالم
نہ لینے دیئے اُس کو اک دم بھی سالم — دئے اُس کو کیا کیا تعب بر تعب ہے

اعتراض سودا

دئے میں دیا ہے یہ کہنا روا ہے — زبان جمع واحد سے یوں آشنا ہے
یہ لہجہ میں حیراں ہوں کس ملک کا ہے — دئے اُس کو کیا کیا تعب پر تعب ہے

(مؤلف) اگر دس مسودہ میں جو میر صاحب کا دستخطی سودا کو ملا تھا۔ کتابت کی غلطیاں نہیں تھیں۔ اور اگر سودا نے ان مصرعوں میں اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کیا۔ تو میں کہوں گا کہ صرف اُن کا اعتراض ہے درست نہیں ہے بلکہ وہ جو کچھ کہتے وہی درست ہوتا۔ اس مصرع کی ساخت اور بندش بھی کچھ دنیا سے نرالی معلوم ہوتی ہے

میر تقی۔

دونوں رات دن تو کٹے ہر طرح میں — بظاہر مصیبت بباطن فرح میں
سحر پر ہوا خون قضا کے قدح میں — کہا ہی لے شبیر تو خشک لب ہے

اعتراض سودا۔

جو پوچھوں قدح میں بھرا خون کن نے — تو بتلاؤ گے تم شہادت کے دن نے
یہ حیران ہوں میں کون ہے وہ کہ جن نے — کہا ہی لے شبیر تو خشک لب ہے

(مؤلف) سودا نے پہلے مصرع پر اعتراض نہ معلوم کیوں نہیں کیا۔ دونوں۔ بروزن فعلن کو بروزن فعَل لانا نہ جب درست تھا نہ اب جائز ہے۔ مجبوری اور عجز طبیعت کی بات ہی دوسری ہے۔

میر تقی۔

سحر تھی کہ تردار کی کوئی جھلک تھی — سحر تھی کہ برقِ ستم کی چمک تھی
سحر تھی کہ کوئی واپسیں کی پلک تھی — سحر تھی کہ موت اس سے ردد رحجب ہو

اعتراض سودا۔

دمِ واپسیں گوش زد ہے ہمارے — پلک واپسیں کی زباں پر تمہارے
پھرے تھی اجل جس جگہ منہ لپیٹے — اسے کہئے پردے وہاں یہ عجب ہے

(مؤلف) اعتراض درست ہے۔

میر تقی

غرض اُس سحر نے جو چہرا دکھایا — شہ دیں نے اسباب رن کا منگایا
حرم نے جواب اس کا اور کچھ نہ پایا — سبھوں کے منہ اوپر طمانچے اور قصب ہے

اعتراض سودا۔

سخن سب کو سب کا خوش و ناخوش آیا — پر اس گفتگو نے نہایت رجھایا
خدا جانے تم اس میں کیا مغز پایا — بدانست اپنے تو ہذیان تب ہے

قمیص و قصب یہاں نہایت ہیں بیجا ۔ بتاؤ مجھے تمنے کیا ان کو سمجھا
کہیں پیرہن کو قمیص اسے ملا ڈا ۔ نباتات میں سے یہ کچھ سو قصب ہی
قصب اس سوا قسم ہے پارچہ کی ۔ نہ اس معنی سے بھی ہوا یہ تسلی
جگہ آپ نے جس ارادے کو یہاں دی ۔ سو لفظوں سے اسکا نکلنا عجب ہی
کہو مرثیہ یہ رُلاوے گا کس کو ۔ روئے گا سر اپنا کوئی سُن کے اسکو
رُولانے کی خاطر سنا دُیہ جس کو ۔ کہو کیا جو پوچھے وہ کیا شئے قصب ہے

(مؤلف) اصل یہ ہے کہ میر صاحب کا مقصد یہ تھا کہ جب امام مظلوم بہ ارادہ جنگ خیمہ سے رخصت ہونے کے لئے تیار ہوئے اور حرم سے اس ارادہ کا اظہار کیا تو سب منہ ڈھانک ڈھانک کر رونے لگے ۔ اور قمیص و قصب نے منہ پہلے لیا مگر قمیص سے مراد یہاں آستین قمیص ۔ اور قصب سے مراد چادر ہے قصب دراصل ایک کپڑے کا نام ہے مگر اہلِ زبان ملبوس کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں ۔ چنانچہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مصرع ۔

قصب باف عروسان بہاری

اسی معنی میں ہے ۔ صاحب موید الفضلا نے اس کے معنے پٹکے کے بھی لکھے ہیں ۔ اس صورت میں سودا کا اعتراض ایسا نہیں کہ اس پر کوئی خاص توجہ کی جائے یا اس کو سنگین کہا جائے ۔ البتہ یہ مصرع ؎

حرم نے جواب اس کا اور کچھ نہ پایا

اپنی بندش کی سستی کی وجہ سے گرا ہوا ہے ۔ اور بروزن رفع یہاں صحیح نہیں ۔ اس لئے کہ دیگر کے معنے میں بروزن فاع زیادہ فصیح ہے اگرچہ لوگوں نے اس میں بے احتیاطی کی ہے ۔ مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر ؎

دل ہی تو ہے سیاست دربان سے ڈر گیا ۔ میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

یہاں اور بروزن رفع کا محل ہے ۔

میر تقی ۔
کہا شاہ دیں نے ای میرے غریبو ۔ زمانے سے ساری عمر بے نصیبو
خزان دل باغ کی عندلیبو ۔ عجب طرح کا تم اُپر فضل رب ہی

اعتراض سودا ۔
خزان دل باغ کب گوش زد ہے ۔ خزاں باغ دل کی کہو تو سند ہے
غلط گوئی کتنی غرض یہاں یہ کہ ہے ۔ اگر فرض و واجب نہیں مستحب ہے

(مؤلف) سودا کے اعتراضات صحیح ہیں ۔ بلکہ اور کئی اعتراض اُن سے چھوٹ بھی گئے ۔ اے ۔ کی ے کا دبنا ۔ عمر ۔ کی میم کا مفتوح لانا ۔ اور ۔ کو اُپر ۔ لکھنا ۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جنسے یقین نہیں آتا کہ یہ مرثیہ میر تقی ایسے استاد کا کہا ہوا ہے ۔

میر محمد باقر حزیں و فتح علی الکرویزی

میر محمد باقر حزیں کا اصلی وطن بقول میر حسن اکبر آباد تھا۔ حزیں تخلص کرتے تھے۔ چونکہ سپاہی پیشہ تھے لہٰذا آب و دانہ اکبر آباد شاہجہاں آباد میں کھینچ لایا۔ اور یہیں میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہوئے۔ عرصہ تک دلی میں رہنے کے بعد دلی سے بنگالہ کی طرف چلے گئے۔ مخزن نکات تذکرۂ قائم یں اور تذکرہ میر حسن میں لکھا ہے کہ وہ سادات اکبر آباد میں سے تھے قائم نے ان کی صفات میں افتادہ مزاجی اور خدمت گزینی کو بھی داخل کیا ہے یہ دہلی میں ملازم تھے۔ مگر شریف گردی نے جب انھیں بیکار کر دیا تو انھوں نے بنگالہ کی طرف کا رُخ کیا اس کے بعد کا کوئی حال معلوم نہیں ہوا

میر تقی میر نے اپنی عادت جاریہ کی مطابق ان کو تفسیریاں مرزا مظہر میں سے لکھ کر ایک قسم کا طنز کیا ہے۔ لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرہ میں میرزا مظہر کا قول بیان کرکے ان کے ساتھ ایک رعنا جوان کے عشق کا بھی الجھڑا لگا دیا ہے۔ بہر حال کچھ ہو اس بات پر سب کو اتفاق ہے کہ خوشگو تھے اور سب نے انھیں اس قابل سمجھا ہے کہ اپنے اپنے تذکروں مین انکا ذکر کیا ہے

فتح علی خان کردیزی

افسوس ہے کہ مجھ کو کردیزی کے متعلق اس کے سوا کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایک تذکرۂ شعرائے ریختہ موسوم بہ تذکرۃ الشعراء ہند کے مؤلف ہیں یہ تذکرہ ڈاکٹر اسپرنگر کے قول کے مطابق ۱۱۶۵ھ میں دہلی مین لکھا گیا۔ اور اس وقت اس کے دو چار نسخے مختلف کتب خانون میں موجود ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں ہر جگہ ان کو فتح علیخاں لکھا ہے مگر مؤلف نے اپنے تذکرہ میں اپنا نام علی الحسینی الکردیزی لکھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں میر محمد باقر حزیں کے ایک شعر پر اعتراض بھی کیا ہے جو بجنسہ درج ذیل کیا جاتا ہے

میر محمد باقر حزیں ؎ فرش ہو جاتا ہوں سنگ آستاں تیرے کو دیکھ — طور کا کرتے تھے جیسے حضرت موسیٰ ادب

اعتراض فتح علیخاں۔ حضرت موسیٰ کی بیہوشی ظہور تجلی کے سبب سے تھی نہ کہ مشاہدۂ طور سے۔ چونکہ یہ قصہ بہت مشہور ہے اس وجہ سے ہم اپنے مختصر تذکرہ میں اوس کی تفصیل لکھنے سے معذور ہین۔ ادعیٰ فعلیہ السند

جواب سید عبد الوالی عزلت۔ جب سے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر تجلی باری تعالےٰ کو دیکھا تھا اس وقت جب آپ طور پر تشریف لے جاتے تھے تو نہایت ادب سے پاؤں رکھتے تھے۔ چنانچہ مفسروں اور محدثوں نے اس قصہ کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ اور حزیں نے ادب حضرت موسیٰ کی تمثیل دی ہے نہ کہ اون کی بے ہوشی کی اس صورت میں فتح علی خاں کا اعتراض بیجا ہے۔ اور کم نظری کی دلیل ہے

---

[1] یہ لحاظ تخلص ان کو ردیف حا حطی میں شامل کرنا زیادہ مناسب تھا۔ مگر چونکہ غلطی ہو چکی لہٰذا اس فرد گزاشت کو میرے لحاظ سے یہیں پورا کیا گیا۔ آسی

جواب لچھمی نراین شفیق - عزلت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیہوشی کو جو طور کی وجہ سے لکھا ہے یہ واقعی اور درست ہے - جیسا کہ قرآن شریف میں موجود ہے کہ فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکّا وخرّ موسیٰ صعقا - یعنی جس وقت اللہ نے پہاڑ پر تجلی ڈالی اُس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے - مگر اس شعر سے بے ہوشی کے معنی اسوقت نکل سکتے ہیں جب فرش ہونیکے معنی بے ہوشی کے لئے جائیں - اس صورت میں البتہ مصرع اولے کا مصرع ثانی سے کوئی ربط باقی نہیں رہتا - اور مطلق چسپاں نہیں ہوتا - سید عزلت سلمہٗ نے جو جواب دیا ہے وہ درست ہے - کیوں فرش ہونے کے معنی بے ہوشی کے لئے جائیں کہ یہ زحمت پیش آئے - قرب سے ادب کے معنی کا استخراج کیوں نہ کریں - تاکہ مصرعے چسپاں ہوں اور معنی صحیح نکلیں - جیسا کہ قرآن شریف کی آیت سے پتہ چلتا ہے " فلما اتھا نودی یاموسیٰ انی ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی - یعنی جب حضرت موسیٰ آئے آگ کے پاس تو آواز دی گئی کہ اے موسیٰ بیشک میں تیرا خدا ہوں - پس تو اپنا جوتا نکال ڈال - تو پاک جنگل طویٰ میں ہے - مجبوراً میں نے بھی دو مصرع لگائے ہیں تاکہ دونوں صاحبوں کے معنی اور جواب برحادی ہوں - اور وہ مصرع یہ ہیں ؎

فرش ہو جاتا ہوں سنگ آستاں تیرے کو دیکھ   برہمن ڈنڈوت جو کرتا ہے بتخانہ کے تئیں

اس مصرع سے معنی فرش ہونے کے بقول فتح علی خاں کے ثابت ہوتے ہیں

واضح ہو کہ ڈنڈوت ہندی کا لفظ ہے اور اس کے معنے اس سجدہ کے ہیں جو بت یا بتخانہ کو دیکھتے ہی دیکھنے والا ادا کرتا ہے دوسرا مصرع یہ ہے ؎

غال کے اسود حجر کا یوں ادب کرتا ہوں میں   طور کا کرتے تھے جیسے حضرت موسیٰ ادب

اصلاح شاہ سامی - ان کا خیال ہے کہ فرش ہونے کا استعارہ وجود ادب سے کیا ہے اگر اصل شعر یوں کہا جاتا تو درست ہوتا

یوں ادب کرتا ہوں سنگ آستاں تیرے کو دیکھ   طور کا کرتے تھے جیسے حضرت موسیٰ ادب

(آسی) عرش ہونے کے معنے ادب و تواضع کے ہیں - اس لئے جواب صحیح اور اعتراض غلط مانے جائیں گے

ناسخ و مولوی عصمت اللہ

شیخ ناسخ کا نام امام بخش تھا - آپ لکھنؤ کے اُن مشاہیر شعراء میں سے ہیں جن کا تذکرہ لکھنا آج ایک زائد سی بات ہے لکھنؤ کی زبان میں اصلاحیں - اور یہاں کی شاعری کے رنگ کی دلّی کے رنگ سے آزادی اون کا وہ معجزۂ ادب ہے جو مطبوع طبائع ہویا نہو مگر تا قیامت یادگار رہے گا انپر بھی مولوی عصمت اللہ شاگرد ناسخ نے اعتراضات کئے ہیں جو درج ذیل ہیں

ناسخ   جب دہاں تنگ دیکھا گور تنگ آئی نظر   مار دو زخ یاد آئے زلف پیچاں دیکھ کر

اعتراض دہان تنگ یاد اور گور تنگ کیا عمدہ تشبیہ ہے -

جواب مولوی آغا علی صاحب - یہاں تشبیہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ شاعر نے اذیت عشق دہن میں مبالغہ کیا ہے مقصود یہ کہ عشق دہن تنگ نے مجھے وہ اذیت پہونچائی کہ گور تنگ کی اذیت یاد آگئی۔

(مولف) حقیقت یہ ہے کہ معترض نے وہ دکھتی ہوئی رگ پکڑی ہے کہ جواب مشکل ہے۔ آپ نے جواب دیا ہے کہ تشبیہ سے کوئی یہاں تعلق ہی نہیں۔ اگر معترض یہ پوچھ بیٹھا کہ جب دہان تنگ اور گور تنگ میں کوئی تشبیہی تعلق نہیں تو پھر دہان تنگ دیکھ کر شیر۔ بھیڑیا کیوں نہ آیا۔ وہ بھی موذی ہیں۔ اور جب اذیت ہی اذیت کے یاد دلانے کا سبب ہے تو پھر یہ غیر ممکن بات نہیں تھی۔ کہ یہ چیزیں یاد آجاتیں۔ مگر چونکہ گور تنگ اور دہن تنگ میں وجہ شبہ تنگی موجود ہے اسوجہ سے دہن تنگ کو دیکھ کر گور تنگ یاد آئی ہے دوسرے یہ کہ اصل نوعیت اعتراض کو مولانا ٹال گئے۔ معترض کا مقصد یہ ہے کہ کسقدر حسین چیز کو دیکھ کر کتنی بھیانک چیز یاد آئی ہے۔

ناسخ ؎ جلوہ فرما بام پر جو عارض جاناں ہوا   ماہ اُسکے سامنے اک کرمک شب تاب تھا

اعتراض - عارض جاناں کا بام پر جلوہ فرما ہونا بھی نئی بات ہے۔

جواب۔ ناواقف کے واسطے ہر ایک بات نئی ہے کچھ اسی پر منحصر نہیں۔ بایں دعوائے باخبری کیا آپ نے حافظ کا یہ مشہور شعر بھی کسی سے نہیں سُنا ؎

جلوۂ کرد رخش روز ازل زیر نقاب   عکسے از جلوۂ او بر رخ افہام افتاد

دیکھئے رخ کا جلوہ کرنا اور عارض کی جلوہ فرمائی ایک ہی بات ہے۔ اور اگر منشا یہ ہے کہ بام کو جلوہ فرمائی سے کیا خصوصیت تھی تو اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک مقابلہ بوجہ احسن عارض کا ماہ سے دوسرے عارض روشن کی بلندی پر سے تشبیہ ماہ آسمان کیساتھ وجہ اول کے واسطے شعر میں (سامنے) کا لفظ شاہد معتبر اور وجہ ثانی اہل بصیرت پر کالشمس فی وسط السماء ظاہر بلکہ اظہر

(مولف) عارض جاناں کا بام پر جلوہ فرما ہونا واقعی انوکھی بات ہے۔ حافظ کا جو شعر سند میں پیش کیا گیا ہے اُس سے اسبات کا ثبوت دیا گیا ہے کہ عارض جلوہ کر سکتا ہے۔ مگر جناب مجیب نے یہ نہیں خیال کیا کہ وہ شعر اس کے بالکل برعکس ہے۔ کہ ازل کے دن زیر نقاب اُس کا رخسارہ ذرا سا جلوہ فرما تھا۔ اور اُس کا تھوڑا سا عکس افہام پر پڑا تھا جس سے یہ روشنی عقلوں میں پیدا ہوگئی۔ بمقابلہ اس کے ناسخ کے یہاں عارض جاناں بالقصد بام پر پہونچا اور اُس نے جاکر اچھے خاصے چاند کو کرمک شب تاب بنادیا۔

ناسخ

یوں لفافہ میں ہمارا ہے کلام شیریں
جس طرح باندھتے ہیں قند کے اوپر کاغذ۔

اعتراض۔ لفافہ میں کلام کا ہونا نئی ترکیب ہے مصرع اول یوں ہوتا۔ یوں لفافہ میں ہے اُس غیرت شیریں کا خط

جواب۔ جناب یہاں کلام کے معنی ہیں وہ اوراق بھی شامل ہیں جس میں کلام مندرج ہو۔ مثلاً۔ اُنھوں نے اپنا کلام اصلاح کے واسطے ولایت بھیجا۔ اس سے مراد وہ اوراق ہیں جن میں کلام مندرج تھا۔

(مولف)۔ مجیب نے مجاز مرسل کی توجیہہ پیش کی ہے۔ جو اول تو یہاں صحیح نہیں ہے۔ اور اگر صحیح ہو تو بھی کوئی مذاق سلیم رکھنے والا اس کو پسند نہ کرے گا جو مصرع اصلاح کرکے پیش کیا گیا ہے۔ وہ مذاق قدیم کے مطابق صحیح تو ضرور ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ناسخ کے مفہوم کو بدل دیتا ہے۔

ناسخ ؎

آئی بہار ہر بن مو سے ہے جوش خوں
ہو جائے سُرخ پہنوں اگر پیرہن سفید

اعتراض۔ "ہر بن مو سے ہے جوش خوں" چہ معنی دارد۔ اگر اس کے بدلے۔ میں۔ کہتے تو بھی اک بات تھی۔

جواب۔ "ہر بن مو میں جوش خوں ہے" ہرگز نہیں بولا جاتا۔ اس محاورہ میں لفظ پیدا آخر سے محذوف ہے اصل میں (ہر بن مو سے جوش خوں پیدا ہے)

(مولف) جواب اور اعتراض دونوں درست ہیں۔ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ یہاں اگرچہ زیادہ تر محل (میں) کا ہے مگر موسیں۔ بُرا معلوم ہوگا۔

ناسخ

ملک ہے عشق کا آزاد قسمت سے مجھے
ہوں جو عیسیٰ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

اعتراض۔ لفظ استعلاج سے مرض فصاحت کا خوب علاج کیا ہے۔

جواب۔ رائے العلیل علیلؒ۔ واقعی یہ مثل بہت ٹھیک ہے جو لوگ زبان اُردو سے واقف نہیں وہ کیونکر اس زبان کے الفاظ فصیح اور غیر فصیح سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ کیوں جناب لفظ استعلاج کی عدم فصاحت پر کیا دلیل ہے آیا یہ کہ لفظ از روئے لغت صحیح نہیں ہے یا یہ کہ اہل بنگالہ کی زبان پر یہ نہیں ہے۔ اگر لفظ کی فصاحت کے واسطے اہل زبان اور فصحا کا بولنا شرط ہے جب تو اس لفظ کی فصاحت میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ اس واسطے کہ ناسخ سا شاعر اسے نظم میں داخل کر چکا۔ اور اگر بنگالیوں کا استعمال مشروط ہے تو بہتر آپ اسے فصیح نہ سمجھئے۔

(مولف) لفظ استعلاج کے صحیح ہونے میں کلام نہیں۔ اور علی الخصوص اس مصرع میں سہ ہوں جو عیسیٰ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا۔

چونکہ یہ باب استفعال سے ہے۔ اور باب استفعال طلب کے لئے آتا ہے اس صورت میں یہاں بہت زیادہ درست ہوگا۔ مگر فصاحت و عدم فصاحت کا جھگڑا پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ یہاں استعلاج کی جگہ علاج بہت اچھا تھا۔ اگرچہ بلحاظ معنی استعلاج ہی زیادہ مناسب ہے۔ اور یوں تو۔ استقامت۔ استطاعت استحقاق وغیرہ سب اُردو میں مستعمل ہی ہوتے ہیں

ناسخ کبھی نہ قطرہ دیا تونے ساقیا مجھ کو ادھر نہ آتش مے کا کوئی شرار آیا

اعتراض و اصلاح۔ اگر مصرع اول یوں فرماتے تو کیا ترکیب بگڑ جاتی مصرع۔ نہ ایک قطرہ دیا تونے ساقیا مجھ کو

جواب۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ تاکید نہ دینے کی کس مصرع میں زیادہ پائی جاتی ہے رہی ترکیب وہ بہت صاف ہے۔ آپ نے اپنے مصرع میں ایک عبث بڑھایا قطرہ اور ایک قطرہ دونوں کا مضمون ایک سا ہے۔

(مولف) جواب صحیح ہے۔ ناسخ کا مصرع اصلاحی مصرع سے زیادہ بہتر اور زیادہ فصیح ہے۔

ناسخ جو ترے عشق میں ہلاک نہیں زندگانی کا لطف خاک نہیں

اعتراض۔ مصرع اول کی ترکیب اور بندش بھی دیدنی ہے۔

جواب۔ ترکیب میں کوئی نقص نہیں بندش بہت صاف ہے۔ مگر چشم بینا چاہئے۔

(مولف) جواب درست ہے۔ پہلا مصرع نہایت اچھا ہے البتہ دوسرے مصرع میں لفظ۔ (اُس کو) کی کمی ہے۔ کاش یہ مصرع یوں ہوتا تو اسکی تمام خامیاں دور ہوجاتیں اور کوئی فرق بندش اور مفہوم میں بھی نہ پیدا ہوتا سہ اُس کو جینے کا لطف خاک نہیں۔ تعجب ہے کہ معترض کی نظر مصرع ثانی پر نہیں پہونچی۔ حالانکہ ضرورت تھی۔

ناسخ سہ عریاں دیکھکر جو لپٹنے کو میں ہوا تیوری چڑہائی آپ نے کپڑے اُتار کر

اعتراض۔ اگر بعد عریانی کے کپڑے اُتارنا کہا جائے تو شعر مہمل ہوجائے گا۔ اور قبل عریانی کے کپڑے اُتارنا اس شعر سے ظاہر نہیں ہوتا۔ کپڑے اُتارنا محاورہ نہیں، البتہ جامے سے باہر ہونا آیا ہے۔

جواب۔ مطلب یہ ہے کہ اے محبوب کپڑے اُتارنے کے بعد تیوری چڑہانے سے کیا حاصل۔ اب کون امر مانع مواصلت رہ گیا ہے۔ اور تیوری چڑہانے کا کون محل ہے۔

(مولف) شعر بالکل مہمل ہے اور جواب میں جو تاویل کی گئی وہ اُس سے زیادہ شرمناک ہے۔ عُریاں کے نون کا اعلان نہایت

نازیبا اور بُرا معلوم ہوتا ہے۔ مفہوم اُس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔

ناسخ ؎ آگے اس گل کے دعوئے خوشبو — باغبار، گل کے منھ پہ ناک نہیں

اعتراض ۔ دعوئے خوشبو کی ترکیب کا بھی عجیب رنگ ہے۔

جواب ۔ ترکیب میں کوئی نقص نہیں۔ رہا لفظ خوشبو اُسے اعتراضِ آیندہ کے جواب میں ملاحظہ کیجئے۔

(مولف) اعتراض غلط ہے۔ دعوئے خوشبو۔ غلط نہیں بلکہ ہازاری شیرازی کا یہ شعر اس کی تائید کرتا ہے ؎

در مرغزارِ حُسن تگاپومی کند — گل پیش یار دعوئے خوشبومی کند

اگر خوشبو کی ترکیب پر اعتراض ہے تو سعدی کا یہ شعر ؎

گلے خوشبوے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم

اُس کے جواب کو کافی ہے۔ اور اگر دعوے کی ترکیب قابل نظر ہے تو کسی اُستاد کا یہ مشہور شعر اُس کے ثبوت میں پیش ہو سکتا ہے ؎

چمن میں گل نے جو کل دعوی جمال کیا — صبا نے مار طمانچہ منھ اُس کا لال کیا

معترض نے اعتراض میں ایک مبہم سا فقرہ لکھ دیا ہے جو کچھ صاف صاف سمجھ میں نہیں آتا ہاں میرے نزدیک اگر کوئی اعتراض کی بات اس شعر میں ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں جو محاورہ مصرع ثانی میں صرف کیا گیا ہے اُس نے شعر میں ایک خاص سُبکی اور کراہت پیدا کر دی ہے۔ اور اس سوقیت کا تمام بار صرف اس محاورے پر ہے جو صرف مراعات النظیر کے پھیر میں پڑ کر لایا گیا ہے۔

ناسخ ؎ اسیری کا جو وقت آیا کہا یوسف نے رو رو کر — مجھے اب کنجِ زنداں میں برادر بند کرتے ہیں

اعتراض ۔ یہ شعر سلام میں ہوتا تو بہتر تھا۔

جواب ؎ غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن — کہ روشن ساخت نور دیدہ اش چشم زلیخا را

اہلی ؎ نہ از یوسف نشاں بینم نہ از یعقوب آثارے — عزیزاں گم شد از یوسف چہ شد یعقوب را بارے

یہ دونوں شعر غزل کے ہیں۔ آپ کے نزدیک بھلا ان کو کہاں جگہ ملنی چاہئے تھی۔

(مولف) جیسا اعتراض مہمل ہے۔ ویسا ہی جواب لغو ہے۔ شعر پر اگر کوئی ایراد واقع ہو سکتا ہے تو اس صورت میں کہا جائے "یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے قید میں نہیں ڈالا تھا" اور یہ بالکل خلاف واقعہ ہے ہاں اگر اس قید کا سبب بھائیوں کے

اُس سلوک کو ٹھہرایا جائے جو انھوں نے روا رکھا تو صحیح ہو سکتا ہے۔

ناسخ ؎ کیا مری تربت اثر میں تودۂ بارود ہے بھاگتا ہی کیوں وہ برق طور میری خاک سے

اعتراض - برق تو بارود سے نہیں بھاگتی۔ برق کا بارود سے بھاگنا ثابت نہیں۔

جواب - برق طور باعتبار ضیا پروری استعارہ ہے محبوب کا یہ ضرور نہیں کہ مستعار لہ اور مستعار منہ بہمہ جہت یکساں ہوں۔ مطلب شعر یہ ہے کہ اے برق طور تو میری خاک سے کیوں بھاگتا ہے۔ کیا اس خاک میں بارود کا خاصہ ہے کہ تیری ضیا کی گرمی سے وہ جلکر تجھے گزند پہونچائے گی۔

(مولف) اعتراض صحیح ہے مجیب نے بھی ہر پھیر کر وہی بات کہی ہے جو معترض نے کہی تھی۔ برق طور کا بارود سے بھاگنا بالکل غیر متعارف بات ہے اگر استعارتاً ہی رکھا جائے تو برق طور سے مراد معشوق ہوگا۔ پھر معشوق کا بارود سے بھاگنا چہ معنی وارد۔ یہ ایک انوکھی بات ہے۔ میرے نزدیک ناسخ کا مافی الضمیر یہ ہوگا کہ جیسے بارود کے جلنے سے آگ کی روشنی میں ایک برق کی سی جھنڈگی پیدا ہوتی ہے اسی طرح وہ میری خاک کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ حالانکہ یہ تاویل بھی لغو سی ہے۔ مفہوم شعر یہ نہیں معلوم ہوتا۔ اور شعر کے الفاظ اس مطلب کی توضیح نہیں کرتے۔

ناسخ ؎ ہاتھ دوڑائیں گے اک دن میری بیعت کو سبو بعد میں پیر مغاں کے صاحب سجادہ ہوں

اعتراض - بعد میں پیر مغاں کے کی ترکیب بھی نہایت عمدہ ہے۔

جواب - ترکیب میں کوئی نقص نہیں۔ میر سے اُستاد مسلم الثبوت کے کلام میں بھی ایسی ترکیبیں موجود ہیں۔

میر ؎ گیا میں جانسے وہ بھی جو ٹک آتا تو کیا ہوتا قدم دو ساتھ میری نعش کے جاتا تو کیا ہوتا

(مولف) میر کا شعر ثبوت میں پیش کرنا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ ترکیب میں کوئی نقص نہیں یہ تعقید شعری ہے جس نے شعر کو بے مزہ کر دیا ہے۔ اور اگرچہ اس کو اساتذہ نے جائز رکھا ہے۔ مگر معیوب بھی قرار دیا ہے۔

ناسخ ؎ ہوگیا ثابت کہ ہے دس خوش قد دنکا تجھ میں حسن تیرے قامت کے الف پر ہے جو نقطہ خال کا

اعتراض - الف کے اوپر نقطہ ہونے سے کوئی اُسے دس نہ سمجھے گا۔ جو معنے مصنف نے اپنے ذہن میں ٹھہرائے ہیں وہ معنی اس شعر سے نہیں نکلتے۔

جواب - یہ اصطلاح علم حساب میں یعنی قبل ہندسہ مستعمل ہے۔ مثلاً دو پر ایک صفر بڑھانے سے بیس ہوتے ہیں۔ یعنی دو کے داہنی جانب ایک صفر زیادہ کرنے سے۔ دیکھئے ایک شعر فارسی میں ذیل میں عرض کرتا ہوں اس سے بھی میرے قول کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

ملا جامی ؎
فزودہ بر الف صفر و ہاترا ا — یکے دہ کردہ آشوب جہانرا

اگر یہاں بغور ملاحظہ کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں متقدمین نے فقط لفظ کے معنے کو معتبر سمجھا ہے۔ اور صفر کے واسطے جگہ کی قید نہیں کی ہے۔

(مولف) ناسخ کے زمانہ میں شعر میں اس قسم کی صنعتیں لائی جاتی تھیں۔ اور ان کو مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ جواب صحیح ہے اور اعتراض غلط ہے۔

ناسخ ؎
جو ہو سوار فرس وہ کریم ابن کریم — بلند بر کرم کا غبار ہو جائے

اعتراض - یہ شعر غزل کے اندر ہے اور اُس کے اوپر کا شعر معشوق کی نسبت ہے۔ نیچے کا شعر زاہد کی نسبت ہے یہ شعر اگر معشوق کی تعریف میں ہے تو ممدوحانہ طور کی ستائش مکروہ ہے۔

جواب - شعرا تو اس طرح کی مدح مکروہ نہیں جانتے۔ حافظ لکھتا ہے ؎

ارباب حاجتیم و زبان سوال نیست — در حضرت کریم تقاضا چہ حاجت ست
آنکہ انگشت نمائی بکرم در ہمہ شہر — وہ کہ در کار غریباں عجب اہمال ست

غالباً یہ شعر آپ کی نظر سے بھی گزرے ہوں۔ یہ بھی غزل ہی میں واقع ہوئے ہیں۔ کریم ابن کریم تو معشوق کے واسطے نازیبا اور مکروہ صفت نہیں خصوصاً اُردو اور فارسی میں اسواسطے کہ ان زبانوں میں معشوق کے واسطے مذکر یا مونث ہونے کی قید نہیں۔ ہاں بعض اوصاف ایسے بھی ہیں کہ وہ واقعی معشوق کے واسطے حالت تعمیم میں مکروہ ہیں اور بعض موزوں طبعان بے خبر از آداب نے اُن کا لحاظ نہیں کیا۔ جیسے شعر ذیل میں شہسوار کی صفت پاک واقع ہوئی ہے۔ ناسخ ؎

گرم جولاں ہوں جو وصف شہسوار پاک میں — یہ براق خامہ اپنا رشک دلدل ہو گیا

دیکھئے یہ شعر بھی غزل کا ہے۔ اوپر کے شعر میں تو ساقی کا ذکر ہے اور نیچے کے شعر میں معشوق کا وصف بیچ میں یہ شہسوار پاک گرم جولاں ہے۔ آداب شناس ایسی ناپاک جگہ پاک کے واسطے ہرگز پسند نہیں کرتے اور یہی ایک بات اس شعر میں ہے کہ وہ حضرت مصنف کی واقفیت اور لیاقت شعر گوئی کا اندازہ بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ براق خامہ کو دلدل پر ترجیح دی ہے حالانکہ

برق خود مرجوح ہے ہاں اگر دلدل خامہ کا رشک براق ہونا کہا جاتا تو البتہ ترقی متصور تھی۔

(مولف) میرے نزدیک اعتراض صحیح ہے۔ معشوق کے لئے مدحانہ الفاظ کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ ناسخ کے شعر میں کریم ابن کریم کہا گیا ہے۔ حافظ کا شعر جو ثبوت میں پیش کیا ہے۔ وہ اس جگہ موزوں نہیں۔ اس لئے کہ اس شعر سے پہلا شعر اگرچہ معشوق ہی کے لئے کہا گیا ہے۔ مگر اس کو بادشاہ تسلیم کر کے کہا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

اے بادشاہ حسن خدارا بسوختیم　　　بارے سوال کن کہ گدارا چہ حاجت است

اور دوسرا شعر یہ ہے ؎

ارباب حاجتیم و زبان سوال نیست　　　در حضرت کریم تقاضا چہ حاجت است

محشی دیوان حافظ نے لکھا ہے کہ "در حضرت کریم مراد از درگاہ رسول مقبول است"

حافظ کا دوسرا شعر اس طرح کا نہیں ہے کہ اس کو صرف ممدوح ہی کے لئے لکھا جا سکتا ہو۔ اس لئے کہ اس میں صرف ایک کرم کا لفظ ایسا ہے کہ اس سے یہ خیال کیا جائے۔ اور یہ لفظ اردو اور فارسی میں ہزاروں جگہ معشوق مجازی کیواسطے مستعمل ہوا ہے۔ شعر کا مطلب اس کے سوائے کچھ نہیں ہے۔ کہ جو شخص اپنے کرم کی وجہ سے تمام شہر میں معروف ہو وہ غریبوں کے کام میں اس قدر تاخیر اور تعویق سے کام لے رہا ہے تعجب کا مقام ہے۔

اب رہا نساخ کا شعر وہ بھی ناسخ کے قریب قریب ہے۔ مگر ویسا نہیں ہے۔ ایسے شعر تو بہت سے کہے گئے ہیں آتش نے تو غضب ہی کیا ہے کہ معشوق کے لئے یہ شعر کہا ہے۔ اس میں کوئی تاویل کی بھی گنجائش نہیں۔

آتش ؎　حلقۂ دیوانگاں ہے اس پری پیکر کے ساتھ　　　اس طرح اصحاب ہوں جس طرح پیغمبر کے ساتھ

بلاشک و شبہ ایسے شعر کے دفتر حالی کے اس شعر کے ذیل میں داخل ہیں۔

گنہ گار واں چھوٹ جائینگے سارے　　　جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

رہا دلدل اور براق کا جھگڑا یہ اعتقادی ہے۔ اس میں کچھ لکھنا فضول سا ہے۔ میرے نزدیک نساخ نے درست لکھا ہے براق پر دلدل کو ترجیح نہیں دیجا سکتی۔

ناسخ ؎　لکھا ہے نقش کوئی ساحری کا خون عاشق سے　　　نظر آتے نہیں یہ لال ڈورے چشم جادو میں

اعتراض۔ ساحری کا نقش بھی عجب ترکیب ہے۔ مصرع اول یوں موزوں کرتے تو اچھا تھا۔

کسی عامل نے نقش حب لکھا ہے خون آہو سے

جواب مولوی آغا علی - کیوں جناب نقش ساحری میں جدّت کیا ہے یہ طریقہ آپ نے خوب اختیار کیا ہے کہ جہاں خود کو واقفیت نہیں اور تعصب بے اعتراض کئے چین نہیں لینے دیتا وہاں ایسے راستے سے نکل بھاگتے ہیں جس سے جہالت ثابت نہو

سلمان ساوجی نہاد شاخ شجر تخہائے برآری کشادباد صبا طبلہائے عطاری

دیکھئے اگر شعر مرقوم بالا میں تخہائے برآری اور طبلہاے عطاری پُرانی ترکیبیں ہیں تو شعر ناسخ میں ساحری کا نقش بھی نئی ترکیب نہیں ہے۔ اگر نئی ترکیب سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ آپ لوگوں نے اُسے شیوع کا سرٹیفکٹ نہیں دیا ہے نہہی ہمارے معرف میں لانے کے واسطے ناسخ کا استعمال کافی ہے۔ رہا آپ کا مصرع محض لغو ہے۔ اس واسطے کہ ساحری کو جو نسبت چشم جادو سے ہے وہ نقش حب کو ہرگز نہیں۔ اور خون عاشق یہاں بہ نسبت خون آہو کے زیادہ رنگین ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے مصرع میں نقش حب کا محرر عامل مذکور ہے اور مصرع شیخ میں محرر مذکور نہیں اور چونکہ یہ معشوق کی آنکھ کا نقش ہے اسواسطے اُس کے محرر کا محجوب اور غیر مذکور ہونا بہتر اور بلاغت افزا ہے۔

(مولف) معلوم ہوتا ہے کہ جواب دیتے ہوئے فاضل مجیب نے معترض کے اعتراض پر غور ہی نہیں کیا اور نقش ساحری کے پھیر میں پڑکر اصل مفہوم اعتراض کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ معترض یہ کہتا ہے کہ ساحری کو نقش سے نسبت کیا ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص بیک وقت ولی بھی ہو اور شیطان بھی۔ یہ واقعہ غلط ہے اور جب غلط ہے تو اس صورت میں ترکیب خود ہی غلط ہو جاتی ہے اور یہی معترض کا مقصد ہے۔ ورنہ نقش ساحری کی ترکیب صفت موصوف یا مضاف مضاف الیہ ہونے میں کیا قباحت ہے۔

ناسخ ؎ ڈر دلا گو کہ نہیں کا کُل دلدار دراز ایک سا زہر ہے کوتاہ ہو یا مار دراز

اعتراض - یہ شعر غلط ہے اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ سب سانپوں کا زہر یکساں نہیں ہوتا۔

جواب مولوی آغا علی - یہ آپ کا قصور فہم ہے کہ آپ تشبیہ کو سمجھے نہیں یہاں تشبیہ وجود زہر میں ہے نہ کثرت و قلت میں مطلب یہ کہ مار کوتاہ ہو یا دراز مادہ سمّی کے رکھنے میں سب یکساں ہیں۔

(مولف) معترض کا اعتراض جو نوعیت رکھتا ہے وہ صحیح ہے۔ مگر مجیب نے جس عنوان سے جواب دیا ہے اُس سے بھی انکار کرنا سراسر انصاف کے خلاف ہے کہ زہر کا وجود ہر سانپ کے اندر ہے اور بہ لحاظ وجود زہر سب برابر ہیں مگر دوسرا مصرع جس میں سانپ کے ساتھ کوتاہ اور دراز لایا گیا ہے کچھ دلنشیں نہیں۔

ناسخ ؎ ملتا ہی نہیں ہجر کا دن کیا ہو اڑی دہوپ — خورشید قیامت نے مرے گھر میں جڑی دہوپ
ایسا ہی تو خورشید جہانتاب پریرو — سو بار عوض گرد کے دامن سے جھڑی دہوپ

اعتراض ۔ دھوپ کا اڑنا ۔ اور جڑنا ثابت نہیں ۔

جواب ۔ ہجر کے دن کا نہ ٹلنا بھی دھوپ کے اڑنے کا ثبوت ہے اس سے زیادہ آپ کیا ثبوت چاہتے ہیں اور جڑ جانا محاورہ اُردو میں بمعنی پائیدان دبریک جا تا دیر قیام نمودن ہے ۔ مصرع اول میں شاعر نے دھوپ کا اڑنا بیان کیا اور مصرع ثانی میں اُسی دھوپ کی تشبیہ خورشید قیامت کی دھوپ کے ساتھ دی ہے ۔ شعر ثانی میں دھوپ کا دامن سے جھڑنا بطریق تجرید بیان کیا ہے یہاں ثبوت کی ضرورت تھی معشوق کو شاعر نے خورشید جہانتاب قرار دیکر اُس میں سے دھوپ کا پیدا ہونا ثابت کیا ہے ۔

(مولف) یہ سب تاویلات بارد و لایعنی ہیں ۔ معترض کا اعتراض اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ۔ اُس کا خیال ہے کہ دھوپ کا جڑنا اور اڑنا صحیح نہیں ۔ اور یہ محاورہ نہیں ہے ۔ جڑنا اور اڑنا دونوں اپنی جگہ صحیح ۔ گر دھوپ کے ساتھ انکا استعمال نامطبوع ہے ۔

ناسخ ؎ وصف جو اُس ماہ تاباں کے کئے میں نے رقم — یک قلم اشعار کے حرفوں پہ ہالا ہو گیا

اعتراض ۔ ہالا چاند کے گرد ہوتا ہے تعدیہ اُس کا بہ لفظ پہ کہ معنیٔ فوقیت رکھتا ہے کیونکر درست ہوگا ۔

جواب ۔ یہ باتیں آپ کہاں تک جان سکتے ہیں زباندان کے واسطے ان باتوں کا بخوبی جاننا بہت مشکل ہے جس طرح چاند ہالے میں ہے ۔ اُسی طرح چاند ہالا پر ہے ۔ دونوں بولتے ہیں اُسی طرح حرف ہالے میں ہے اور حرف پر ہالا بھی بولا جاتا ہے ۔

(مولف) چاند ہالہ پر زباندان اور اہل زبان دونوں کے واسطے غلط اور نہایت غلط ہے ۔

ناسخ ؎ بدتر ہے مزبلہ سے بھی دیکھیں جو کھول کر — ظاہر میں معبد سے بھی بہتر ہی شان گور

اعتراض ۔ یہ کلیہ جو ٹھیرالیا ہے اس کی خرابیاں اس قابل نہیں ہیں کہ بیان میں آویں اگر کوئی شخص بیان بھی کرے تو گستاخی اور بے ادبی سے محفوظ نہیں رہ سکتا ۔ لاحول ولا قوۃ ! ہاں اگر از راہ انکسار استخارہ مصنف نے اپنی گور کی نسبت پیشینگوئی کی ہے تو جائے اعتراض نہیں ۔

جواب مولوی آغا علی ۔ گو یہ مضمون ایک حیثیت سے کلیہ ہونے کی لیاقت رکھتا ہے مگر چونکہ اس کے کلیہ ہونے میں وہی الزام لازم آتا ہے جو آپ نے غلطی سے دیا ہے اسواسطے شیخ صاحب نے ایسے الفاظ کا استعمال کیا جن سے معترض کو مجال باقی نہ رہے اس غرض اور اس مقصود کو لفظ گو کی وحدت نے بخوبی ظاہر اور اچھی طرح ثابت کر دیا تعمیم کی چھاؤں بھی

مضمون پر نہیں پڑنے پائی۔ معنی شعر یہ ہیں کہ دنیا میں ایسی گور بھی ملے گی کہ ظاہر میں اُس کی شان معبدے سے بہتر ہو لیکن اگر اُسے ٹٹول کر دیکھیں تو وہ بدتر از مزبلہ معلوم ہوگی۔ ہر گور کا بدتر از مزبلہ ہونا شعر کے کسی لفظ سے ثابت نہیں۔

(مولف) میرے نزدیک اعتراض صحیح ہے۔ ناسخ کے شعر میں سراسر تعمیم کی صورت ہے۔ لفظ گور جس سے وحدت یا استثنا کا ثبوت دیا گیا ہے یہ زبردستی کی بات ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ناسخ مرحوم کہنا چاہتے ہیں کہ ظاہر میں شانِ گور معبدے سے بھی بہتر ہے اور اصل میں مزبلہ سے بدتر ہے۔ یعنی ہر گور ایسی ہی ہوتی ہے ہاں اگر کسی شخص خاص کے لئے لکھ رہے ہوتے تو ایسا ہو سکتا تھا۔

ناسخ ؎ خیال زلف میں ہم باغ جو گئے ناسخ تمام برگ تھے کفچے ہر ایک مار کی شاخ

اعتراض۔ اس شعر کا مصرع ثانی مہمل ہے۔ اگر یوں کہتے تو معنی دار ہو جاتا ؎

تمام برگ تھے کفچے زبان مار کی شاخ

جواب۔ شیخ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم خیال زلف میں باغ کی سیر کو گئے تو ہم کو سب درختوں کے پتے بشکل کفچہ ہائے مار نظر آئے۔ اسواسطے کہ پتوں سے اور کفچہ ہائے مار سے تشبیہ تام ہے۔ یہاں مشبہ حسی اور مشبہ بہ غیر حسی ہے۔ اور ہر ایک کا لفظ درختوں کی ہر شاخ کا بین ہے یعنی ہر درخت کی ہر شاخ سانپ کی صورت دراز نظر آتی تھی یہاں بھی مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی ہے اور وجہ شبہ درازی جو مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کو شامل ہے اور اگر ہر ایک کی لفظ کو ہم سانپوں کے جملہ اقسام کا مبین قرار دیں تو جب بھی معنی شعر دہی باقی رہیں گے۔ آپ فرمائیے اس میں کیا وقت باقی رہی۔ ہاں آپ نے جو مصرع ثانی میں اصلاح دی ہے وہ البتہ مہمل ہے اس لئے کہ آپ نے دراز شاخ کو زبان مار سے تشبیہ دی ہے یہاں مشبہ تو حسی ہے مگر مشبہ بہ میں جو وجہ شبہ ہے وہ اسقدر کہاں دراز ہے جو شاعر کے مقصود پر دلالت کر سکے۔

(مولف) میرے نزدیک ناسخ کا شعر غلط نہیں ہے۔ مگر معترض اور مجیب دونوں نے اس کے معنے سمجھے ہی نہیں ورنہ یہ اعتراض کی ضرورت نہ پڑتی اور نہ اس جواب طویل کی نوبت آتی۔ شعر کے معنی یہ ہیں۔ کہ اے ناسخ زلف کے خیال میں سیر باغ کے لئے ہو چلے۔ تو چونکہ خیال زلف تھا لہذا باغ بھی ویسا ہی نظر آیا۔ کہ تمام پتے اُس باغ کے سانپ کے پھن سے بنے تھے۔ اور ہر ایک شاخ اُس باغ کی سانپ کی تھی۔ مجیب اور معترض نے مفہوم یہ سمجھا کہ باغ کے تمام پتے ہمکو کفچے معلوم ہوئے اور ہر شاخ سانپ معلوم ہوئی۔

ناسخ ؎
نہیں بجھتے جو خاکستر سے اخگر بند کرتے ہیں
درازی عمر کی ہے ہر کسی کی خاکساری سے

کوئی نامہ بھیج یا پیغام بھیج
ہوں میں بے آرام کچھ آرام بھیج

اعتراض - پہلے شعر میں خاکستر سے اخگر بند کرنا نئی ترکیب ہے اور خلاف محاورہ دوسرے میں آرام بھیجنا خلاف محاورہ -

جواب - محاورہ آپ کیا جانیں - محاورہ وہی صحیح ہے جو لکھنؤ کے مستند شعرا کے استعمال میں ہو محاورات کی نسبت سند زباندان کو دینی چاہئے نہ اہل زبان کو آپ کے واسطے یہی شعر سند ہے - کجا ساحل دریائے شور اور کجا اودھ جناب یہ اُردو ملاحوں کی زبان نہیں ہے - اس میں آپ کو کیا مداخلت ہے ترکیب بھی بہت عمدہ ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اگر تھی تو آپ نے بیان کی ہوتی -

(مولف) معترض کے دونوں اعتراض بالکل صحیح ہیں - نہ خاکستر سے اخگر بند کرنا محاورہ ہے اور نہ آرام بھیجنا محاورہ ہے -